واردات اس رات کی

جرم اور سراغرسانی کی ایک لرزہ خیز واردات

احمد یار خان

JED Press

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱۔	پیش لفظ	۷
۲۔	بیوی کو طلاق دے دی تھی	۱۳
۳۔	دو بہنیں اور کھانے پینے والی ماں	۱۸
۴۔	وہ ہوش میں آ گیا	۲۲
۵۔	دونوں بھائی اپنی بہنوں جیسے تھے	۲۶
۶۔	عورت واقعی چالاک تھی	۳۰
۷۔	انوری عصمت لٹا بیٹھی	۳۳
۸۔	انوری کا ایک مایوس امیدوار	۴۰
۹۔	بے غیرت ماں کی بیٹیاں	۴۳
۱۰۔	تمہارے ساتھ عورت کون تھی؟	۴۷
۱۱۔	رجی بیوہ ہوگئی تو.....	۵۳
۱۲۔	کھرا اُس خوبصورت عورت کا تھا	۵۷
۱۳۔	انوری اور راحیلہ کے بعد وحیدہ	۶۱
۱۴۔	کلہاڑی برآمد ہوئی	۶۴
۱۵۔	وہ میں تھا	۶۷
۱۶۔	محبت ہو تو ایسی ہو	۷۵
۱۷۔	انوری لاپتہ ہوگئی	۷۸
۱۸۔	بیٹی کو ماں نے شیطانی راستے پر ڈالا	۸۲
۱۹۔	یہ شخص پاپی تھا	۸۶
۲۰۔	اُس کے گھر شام کے بعد جاتی رہی	۸۹
۲۱۔	حفیظ اور انوری ایک دوسرے کے بازوؤں میں	۹۳
۲۲۔	میرے سہاگ کا خیال رکھنا	۹۷
۲۳۔	آپ کو انوری ملے گی نہیں	۱۰۱

۲۴۔ کلہاڑی پھر چل گئی ۱۰۳
۲۵۔ چاقو اُس کی ران میں رہ گیا ۱۰۶
۲۶۔ نوزائیدہ بچے کی لاش ۱۰۹
۲۷۔ وہ آگے آگے چل پڑی ۱۱۲
۲۸۔ رونے کے سوا کیا کر سکتی تھی! ۱۱۵
۲۹۔ وہ تیار ہو گئی ۱۲۰
۳۰۔ بڑی خوبصورت چڑیل ۱۲۳
۳۱۔ وہ تو پردے میں رہنے والی لڑکی تھی ۱۲۶
۳۲۔ میں نے جھوٹ بلوایا ۱۳۰
۳۳۔ پیسوں کی صورت میں، پیار کی صورت میں ۱۳۵
۳۴۔ مولوی کے گھر میں ۱۳۸
۳۵۔ پھر سوتیلی ماں آ گئی ۱۴۱
۳۶۔ میرے ہاتھ میں بندوق ہو تو..... ۱۴۵
۳۷۔ راحیلہ کی چیخیں ۱۴۹
۳۸۔ زہر کا پیالہ ۱۵۲
۳۹۔ ''تم اپنے بیٹوں کے ہاتھوں قتل ہو گی'' ۱۵۶
۴۰۔ شلوار اُوپر کر دی ۱۶۴
۴۱۔ قمیض پر بھی خون کے چھینٹے تھے ۱۶۸
۴۲۔ انوری نے کہا۔ ''آئینے میں اپنی شکل دیکھو'' ۱۷۲
۴۳۔ قتل یا خودکشی؟ ۱۷۹
۴۴۔ انوری کہاں جا پہنچی؟ ۱۸۲
۴۵۔ ''خاموشی سے چلی چلو'' ۱۸۷
۴۶۔ بیوی مر گئی تو خاوند خوش ہوا ۱۹۱
۴۷۔ تباہی کا دوسرا پہلو دیکھو ۱۹۴
۴۸۔ کنواری بیٹی کی آبرو اور ماں کی بددُعا ۱۹۸
۴۹۔ ''کسی گناہ کی سزا بھگت رہے ہو'' ۲۰۲
۵۰۔ ''میری جگہ آپ کی بیٹی ہوتی تو.....'' ۲۰۶
۵۱۔ پانچ سال بعد، آخری ملاقات ۲۱۰

پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی کہانیوں کے متعدّد مجموعے پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں مصنّف کی ایک مکمل کہانی پیش کی جا رہی ہے۔

جرم و سزا، سراغرسانی اور تفتیش کی سچی کہانیوں میں احمد یار خان کا نام سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ کہانی ''واردات اُس رات کی'' افسانہ ہوتی تو میں اسے افسانوی ادب کی کسوٹی پر پرکھتا، اس کے پلاٹ اور مکالموں پر تنقید کرتا، ضرورت کے مطابق داد دیتا لیکن ''واردات اُس رات کی'' وہ حقیقت ہے جو افسانے سے زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز ہوتی ہے۔

حقیقی کہانی پر یہی تنقید کی جا سکتی ہے کہ یہ حقیقی نہیں۔ آپ یہ تفتیشی کہانی پڑھیں گے تو آپ خود کہیں گے کہ یہ کہانی جھوٹی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ڈرامے ہمارے معاشرے میں آج بھی کھیلے جاتے ہیں۔ انوری اور راحیلہ کی ماں جیسی مائیں ہماری چار دیواری کی دنیا کے اندر موجود ہیں۔ بختیار جیسے شکاریوں کی بھی کمی نہیں۔ صغیر بھی کئی موجود ہیں۔ ہمارے ہاں تکّے بھی ہیں، ملنگ بھی ہیں۔

ہو سکتا ہے یہ آپ کے اپنے محلّے کی کہانی ہو۔ ایسے کرداروں سے آپ ناواقف نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں، بولتے نہیں۔ جو ہوتا ہے ہوتا رہے، آپ کو اس سے کیا مطلب لیکن چار دیواری کی دنیا کی یہ

ڈھکی چھپی وارداتیں جب تھانے کے احاطے میں داخل ہوتی ہیں تو سنسنی خیز کہانیاں اور ناقابلِ فراموش داستانیں بن جاتی ہیں۔

"واردات اُس رات کی" ایسی ہی سچّی کہانیوں میں سے ایک ہے جو گھر کی چار دیواری سے نکل کر تھانے کی چار دیواری میں گئی تو جرم و سزا کی بھیانک واردات بن گئی۔ پھر اس نے کئی وارداتوں کو جنم دیا۔

عنایت اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

میں آپ کو ایسی کہانیاں سُنایا کرتا ہوں جن میں انسانی فطرت کے ڈھکے چُھپے پہلو بے نقاب ہوتے ہیں۔ اِن میں بعض واقعات قابلِ یقین نہیں لگتے، لیکن انسان کی فطرت ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں نہ جانے کیا کچھ چُھپا ہوا ہے۔ ہر انسان کا چہرہ ایسی دکان کا شوکیس ہے جس میں چند ایک اشیاء رکھی ہوتی ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ اس دکان میں یہی اشیاء ملتی ہیں لیکن دکان کے اندر سمگل کی ہوئی ایسی اشیاء کا درپردہ کاروبار ہوتا ہے جن کی درآمد ممنوع ہے۔

میں آپ کو ایک جرم کی کہانی سُناتا ہوں۔ میں نے اس کی تفتیش کی تھی۔ آپ اس کا تجزیہ کرلیں اور انسانی فطرت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

وہ ہندوستان کا ایک قصبہ تھا لیکن شہر بن گیا تھا۔ پہلے تجارتی مرکز تھا پھر صنعتی مرکز بننے لگا۔ کارخانے کھلنے لگے اور اس کی آبادی بڑھنے لگی۔ میں اس شہر کے تھانے کا انچارج تھا۔ آدھی رات کے قریب میں اتفاق سے تھانے میں موجود تھا۔ ایک کام ختم کرنا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی ضلع ہیڈکوارٹر گیا ہُوا تھا۔ میں کام تقریباً ختم کرچکا تھا اور گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تھانے کے احاطے میں ایک گھوڑا داخل ہُوا۔ اس کی رفتار بتا رہی تھی کہ سوار جلدی میں ہے۔ وہ برآمدے کے قریب آکر گھوڑے سے اترا۔ ادھیڑ عمر کا یہ آدمی لباس اور صاف ستھری پگڑی سے خوشحال دیہاتی لگتا تھا۔

اُس نے بتایا کہ وہ اپنے کسی کام سے ایک گاؤں سے اپنے گاؤں کو واپس آرہا تھا۔ یہ دونوں گاؤں شہر کے مضافات میں تھے۔ یہ آدمی شہر سے دو اڑھائی فرلانگ دُور سے کھیتوں میں سے گذر رہا

تھا تو اُس نے ایک آدمی کو زمین پر پڑے دیکھا۔ اس سوار کے پاس ٹارچ تھی۔ آدمی عقل والا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے گھوڑے سے اُترے بغیر ٹارچ کی روشنی زمین پر پڑے ہوئے آدمی پر ڈالی۔ اُس کے کپڑے خون سے لال تھے۔ سر سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ زخمی مرا ہُوا نہیں تھا۔ اُس کے دونوں بازوؤں کو حرکت کرتے اس سوار نے دیکھا تھا۔

گھوڑ سوار نے اس خیال سے گھوڑے سے اُتر کر اس زخمی کو نہ دیکھا کہ پولیس لاش یا بے ہوش زخمی کے قریب کھُرے دیکھا کرتی ہے۔ اگر یہ آدمی اُتر کر قریب چلا جاتا تو ملزموں کے کھُرے مِٹ جاتے۔

یہ آزادی سے پہلے کی واردات ہے۔ قانون کا احترام کیا اور کرایا جاتا تھا۔ لوگ پولیس کی مدد کرتے تھے۔ کسی کو ذرا سے بھی سراغ کا علم ہوتا تو وہ خود اگر تھانے نہ آتا تو کسی کانسٹیبل کو یا نمبردار وغیرہ کو بتا دیتا تھا۔ آج کل تو یہ حالت ہے کہ دن دہاڑے محلّے یا سڑک سے لڑکی اٹھالی جاتی ہے، کوئی کسی کو چاقو چھُری مار کر بھاگ جاتا ہے، رات کو سڑک پر لاش یا زخمی نظر آجائے تو کوئی آدمی گواہی نہیں دیتا۔ عینی شاہد بھی کہہ دیتے ہیں کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں تھے۔ سب شہری پولیس کے رویّے اور نیّت سے ڈرتے ہیں۔ آج کل جرائم کی جو بھرمار ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پولیس اور جرائم پیشہ افراد کے تعلقات کی نوعیّت کچھ بدل گئی ہے۔

یہ گھوڑ سوار اپنے گاؤں کو جا رہا تھا لیکن اُس نے اپنا فرض سمجھا کہ پولیس کو اطلاع دے کہ ایک جُرم سرزد ہُوا ہے۔ میں نے اُسی وقت گھوڑی منگوائی۔ ہیڈ کانسٹیبل اور دو تین کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور اطلاع لانے والے کے ساتھ موقعۂ واردات پر چلا گیا۔ میں نے چلنے سے پہلے ایک کانسٹیبل کو کھوجی کے گھر بھیج دیا تھا۔

کھوجی کے آنے تک میں نے خود ٹارچ اور دو لالٹینوں کی روشنی میں کھُرے دیکھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں سب سے پہلے زخمی کو اٹھا

کر ہسپتال بھیجتا لیکن مجھے کھُروں کا زیادہ خیال تھا۔ زمین کچّی اور دُھول والی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں دو یا تین آدمیوں کی لڑائی ہوئی ہے۔ مجھے کچھ کھُرے بڑے صاف نظر آرہے تھے۔ ایک کانسٹیبل کو ایک آدمی کی طرف دوڑایا کہ چارپائی اور دو چار آدمیوں کا بندوبست کر کے لے آئے۔ مجھے زخمی کے جسم میں کچھ حرکت نظر آرہی تھی۔ چارپائی آنے تک میں نے جو کھُرے دیکھے تھے اُن کے اردگرد چھڑی سے گول دائرے بنا دیے۔

بیوی کو طلاق دے دی تھی

چارپائی اور کچھ آدمی آئے اور اُن کے ساتھ ساتھ کھوجی بھی آگیا۔ جو کھُرے میں نے دیکھے تھے وہ ایک طرف تھے اور اتنا تو میں بھی دیکھ سکتا تھا کہ کھُرے آئے اور اُدھر سے ہی واپس چلے گئے۔ کھُروں سے بچتے ہوئے یہ آدمی آگے ہوئے اور زخمی کو اٹھا کر چارپائی پر ڈالا۔ میں نے نظری معائنہ کیا۔ ایک زخم سر پر سامنے سے اس طرح تھا کہ اس نے دائیں آنکھ اور پیشانی کو کاٹ دیا تھا۔ ایک لمبا زخم ایک کندھے پر تھا جس نے ہنسلی کاٹ دی تھی۔ ایسا ہی ایک گہرا زخم پیٹھ پر شولڈر بلیڈوں کے درمیان تھا۔ یہ تمام زخم کلہاڑی کے معلوم ہوتے تھے۔ جسم کا خون ختم ہونے کو تھا۔ زخمی کا رنگ لاش کی طرح ہو چکا تھا۔ میں نے زخمی کو ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ہسپتال بھجوایا اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ ڈاکٹر سے کہنا مجھے نزعی بیان لینا ہے۔

چارپائی لانے والوں نے زخمی کو پہچان لیا تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اُس کے گھر اطلاع دے اور وہ لوگ ہسپتال پہنچ جائیں۔ دو کانسٹیبلوں کو میں نے کھوجی کے ساتھ چھوڑا۔ ٹارچ اور لالٹین انہیں دے دیں۔ مجھے چونکہ نزعی بیان لینا تھا اور زخمی آخری دموں پر تھا اس لیے میں گھوڑی پر سوار ہُوا اور ہسپتال کی طرف چل پڑا۔ جو آدمی اطلاع لایا تھا' اُس سے اُس کا نام پتہ پوچھ کر میں نے فارغ کر دیا اور اسے کہا کہ وہ علی الصبح تھانے آجائے۔

میں زخمی کے پیچھے پیچھے ہی ہسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر ہسپتال کے احاطے میں ہی سرکاری مکان میں رہتا تھا۔ وہ کانسٹیبل کے ساتھ آرہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ زخمی کو نزعی بیان دینے کے لیے ہوش میں لانا ہے۔ ڈاکٹر نے اُسی وقت زخمی کو اندر لے جا کر اپنا کام شروع کر دیا۔ اُس نے زخمی کی حالت دیکھ کر مجھے بتایا کہ زخم تو گہرے ہیں لیکن ان میں مہلک زخم ایک بھی نہیں۔ کھوپڑی ذرا سی فریکچر ہوئی ہے۔ اگر اسے مرنا ہُوا تو خون کی کمی سے مر جائے گا۔ خون خطرناک حد تک کم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تازہ خون مل جائے تو یہ جلدی ہوش میں آجائے گا۔

ڈاکٹر نے زخموں کی لمبائی اور گہرائی کی پیمائش شروع کر دی۔ یہ کوائف عدالت میں بے حد ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر جب مرہم پٹی کر رہا تھا تو زخمی کے خاندان کے کئی افراد آ گئے۔ پانچ چھ مرد تھے، تین چار عورتیں تھیں۔ مردوں میں ایک تو اس کا باپ تھا اور دو بھائی۔ باقی چچا زاد اور ماموں زاد تھے۔ عورتیں واویلا بپا کیے ہوئے تھیں۔ مرد بہت پریشان تھے۔ ان سب نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ میں نے انہیں کہا کہ سب سے پہلے زخمی کو خون دو۔ زخمی کے تمام لواحقین، کیا مرد کیا عورتیں، خون دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

مرہم پٹی اور خون دینے والوں کے خون کے گروپ معلوم کرنا اور خون دینا کئی گھنٹوں میں مکمل ہونے والے کام تھے۔ میری دلچسپی صرف اس میں تھی کہ زخمی بیان دینے کے قابل ہو جائے۔ مجھے احساس تھا کہ جو منٹ گزر جاتا ہے، وہ ملزم یا ملزموں کو مجھ سے دُور لے جاتا ہے۔ زخموں کی نوعیت بتا رہی تھی کہ کسی نے انتقامی وار کیا ہے۔ یہ رہزنی کی واردات نہیں تھی۔ زخمی کی انگلی میں سونے کی وزنی انگوٹھی تھی اور اس کی جیب میں پیسے بھی تھے۔ رہزن اپنے شکار کو ڈرانے کے لیے اگر وار کریں بھی تو وہ قتل نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ کلہاڑی کی ایک ہی ضرب کو کافی سمجھتے تھے۔

جب زخمی کا باپ اور اُس کے بھائی خون دے چکے تو میں نے

زخمی کے باپ کو الگ بٹھا لیا۔ ڈاکٹر نے ابھی زخمی کو فارغ نہیں کیا تھا۔ اُس نے اندر سے اطلاع بھجوائی تھی کہ زخمی اگلے روز دس گیارہ بجے تک ہوش میں آئے گا۔ اگلا روز شروع ہو چکا تھا۔ اذان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بوڑھے باپ سے پہلا سوال وہی کیا جو اس قسم کی وارداتوں میں کیا جاتا ہے، یعنی کوئی دشمنی؟

باپ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے کچھ ایسا جواب دیا جیسے دشمنی ہے بھی اور نہیں بھی۔

"بڑے میاں!"۔۔۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ "مجھے دو ٹوک جواب دیں۔ دشمنی ہے تو مجھے صاف بتائیں کس کے ساتھ ہے۔ نہیں ہے تو صاف بتائیں کہ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے۔ آپ کے بیٹے پر کسی نے قاتلانہ کیا ہے۔ یہ صرف دشمن کیا کرتے ہیں۔"

"میرا بیٹا کسی کے ساتھ دشمنی رکھنے والا نہیں۔"

"میں آپ سے آپ کے بیٹے کے چال چلن کا سرٹیفکیٹ نہیں مانگ رہا"۔۔۔ میں نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔۔۔ "آپ کے گول مول سے جواب نے مجھے شک میں ڈال دیا ہے۔ جو باتیں مجھے دوسروں سے بعد میں پتہ چلیں گی وہ آپ اپنی زبان سے مجھے ابھی بتا دیں۔ پردہ نہ ڈالیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ کل آپ کے کسی اور بیٹے پر ایسا ہی وار ہو جائے۔"

"دشمنی اتنی سی ہے کہ ایک سال ہُوا میرے بیٹے نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی"۔۔۔ باپ نے کہا۔۔۔ "اُن کے ساتھ ہماری بول چال اور دیگر دُنیاداری کے تمام تعلقات بالکل ختم ہیں۔"

"کیا لڑکی والوں نے اُس وقت یا پھر کبھی آپ کو یا آپ کے بیٹے کو انتقام کی دھمکی دی تھی؟"

"دھمکیاں تو انہوں نے بہت دی تھیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "اُنہوں نے تو یہاں تک کہا تھا کہ تمہاری جوان بیٹی کو اٹھوا دیں گے۔"

"یہ دھمکیاں آپ کو کب تک ملتی رہیں؟"

"کوئی پانچ چھ مہینے تک"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔۔

"اس کے بعد وہ لوگ خاموش ہو گئے تھے۔"

"کیا اُس لڑکی کی کہیں دوسری جگہ شادی ہو گئی ہے؟"

"نہیں"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔۔ "اُس کے گھر والے اُس کی شادی فوراً کر دینا چاہتے تھے لیکن سُنا ہے کہ لڑکی نے انکار کر دیا ہے۔"

"طلاق کی وجہ کیا تھی؟"

"لڑکی اچھی نہیں تھی"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"بڑے میاں!"۔۔۔۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے ہلاتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "میں آپ کو ایک بار پھر کہتا ہوں کہ مجھے جو بھی جواب دیں سوچ سمجھ کر دیں اور مجھے گمراہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اب آپ کہیں گے کہ آپ کا بیٹا بڑا ہی اچھا اور نیکو کار تھا تو میں تسلیم نہیں کروں گا۔ میں آپ سے کوئی کہانی نہیں سُن رہا میں تفتیش کر رہا ہوں۔ مجھے طلاق کی صحیح وجہ بتائیں۔ اگر آپ اس وقت ایسی ذہنی کیفیت میں نہیں کہ مجھے ٹھیک ٹھیک جواب دے سکیں تو مجھے بتا دیں۔ میں بھی انسان ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ اس وقت آپ کو میں نہیں بلکہ اپنا بیٹا نظر آ رہا ہے۔"

اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں بے بسی اور غم تھا۔ اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کی خیریت کی خبر کا انتظار کرے۔ وہ چلا گیا۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر مرہم پٹی کر چکا ہے لیکن زخمی ابھی ہوش میں نہیں آیا اور خون دیا جا رہا ہے۔ میں نے زخمی کے بڑے بھائی کو بلایا اور اُس سے وہی سوال پوچھے جو میں اُس کے باپ سے پوچھ چکا تھا۔ جواب دینے کی بجائے اس شخص نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ یہاں تک کہہ گیا کہ آپ تفتیش

کریں، نہ کریں، میں اس شخص کو زمین کے نیچے سے نکال لاؤں گا جس نے میرے بھائی پر ہاتھ اٹھایا ہے۔

اس شخص کے اس انداز اور رویّے سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ لوگ شریفوں میں سے نہیں۔ میں نے ایسا انداز اختیار کر لیا جیسے میں بھی اُس سے ڈرتا ہوں۔ میں نے اُسے کہا کہ اُسے تو معلوم ہو گا کہ اُس کے بھائی کا دشمن کون ہے۔

"جو کوئی بھی ہے اُس کی لاش آپ کو مل جائے گی"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"مجھے نہیں بتاؤ گے کہ وہ کون ہے؟"۔۔۔۔ میں نے ڈرے ہوئے کمزور سے آدمی کے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کو پتہ چل جائے گا"۔۔۔۔ اُس نے مجھے واقعی ڈرا ہُوا سمجھ کر جواب دیا۔

میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے جھنجھوڑا اور کہا۔۔۔۔ "تم اپنے باپ سے نہیں ایک تھانیدار سے بات کر رہے ہو۔ میں تفتیش کر رہا ہوں۔ تم مجھ سے مجرم کو چھپا رہے ہو.... کون ہے وہ؟ فوراً بتاؤ۔"

"جسے میرے بھائی نے طلاق دی تھی اُس کے بھائیوں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"ایک سال بعد انہیں اب انتقام لینے کی کیا سوجھی ہے؟"۔۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔۔ "کیا اس سے پہلے انہیں تمہارے بھائی پر قاتلانہ حملہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا؟"

"ان کے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ لوگ ابھی مغموم بھی ہیں اور بھڑکے ہوئے بھی ہیں اس لیے ان سے ابھی کام کی کوئی بات نکلوانا ذرا مشکل ہو گا۔ میں نے اُس سے کہا کہ ابھی وہ چلا جائے اور اپنے دماغ پر زور دے کر سوچے اور اِدھر اُدھر سے پُوچھے کہ اُس کے بھائی کا دشمن کون ہے۔

دو بہنیں اور کھانے پینے والی ماں

دو اڑھائی گھنٹے گزر گئے تھے، ابھی زخمی ہوش میں نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ وہ زندہ رہے گا۔ خون کی کافی مقدار دی جا چکی تھی اور کوئی بھی زخم مہلک نہیں تھا۔ مجھے ہسپتال میں ہی رُکنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد کھوجی میرے پاس ہسپتال میں ہی آگیا۔ اُس نے موقعۂ واردات پر اور اس سے کچھ دُور دُور تک جو کھُرے دیکھے تھے وہ اپنی اصطلاحوں میں بیان کئے۔ میں آپ کو صرف ضروری کھُرے سناتا ہوں جو اُس نے وہاں دیکھے تھے۔

ایک تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں، زمین پر ایسے نشان تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ زخمی پر حملہ کیا گیا تو اُس نے مقابلہ کرنے کی یا بچنے کی کوشش کی۔ دو کھُرے صاف طور پر ملے۔ ایک مرد کا اور ایک عورت کا تھا۔ یہ اُس زمانے کا ایک زنانہ سینڈل تھا۔ کھُروں میں مزید سہولت یہ ہوگئی کہ مرد کے دائیں پاؤں کی جوتی کے نیچے تولا مرمت کرایا ہُوا تھا۔ یہ ٹکڑا الگ تھلگ نظر آتا تھا۔ یہ دونوں کھُرے وہاں تک گئے جہاں میں نے زخمی کو پڑے دیکھا تھا۔ وہاں سے دونوں کھُرے واپس چلے گئے اور کچی زمین سے گزر کر پکی گلی میں داخل ہو گئے۔ پکی گلیوں میں کھُرا تلاش کرنا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا۔

دوسری طرف ایک کھُرا اور نظر آیا۔ پتہ چلتا تھا جیسے یہ کوئی آدمی تھا جو اُدھر آیا اور اُس نے یہاں زخمی کو پڑا دیکھا اور وہ ڈر کر واپس چلا گیا۔ یہ کھُرا صاف نہیں تھا۔ بہرحال میں نے اسے نظرانداز نہ کیا۔

عورت کا کھُرا یہ کہانی سُناتا تھا کہ اس واردات کے ساتھ کسی عورت کا بھی تعلق ہے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ یہ عورت زخمی کے ساتھ تھی اور عورت کے خاوند یا بھائیوں نے انہیں موقع پر پکڑ لیا۔ لیکن یہ سراغ کچھ اُلجھا اُلجھا سا تھا۔ میں کھوجی کے ساتھ پھر موقعۂ واردات پر چلا گیا۔ ایک کانسٹیبل اور ایک چوکیدار کھُروں کی رکھوالی کے لیے وہاں موجود تھے۔ میں بھی کھُروں کے متعلق کچھ سمجھنے لگا تھا۔ میں نے جب اس مرد اور عورت کے کھُرے دیکھے تو میں نے کھوجی سے کہا کہ کھُرے بتاتے ہیں کہ یہ دونوں بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے موقعۂ واردات تک آتے ہیں اور اسی طرح اطمینان سے واپس چلے گئے ہیں۔ اگر عورت غیر مرد کے ساتھ پکڑی جاتی تو اُس کے کھُرے اس طرح نہ ہوتے۔ اُسے مارا پیٹا اور گھسیٹا جاتا۔ اس صورت میں کوئی پاؤں کہیں پڑتا اور کوئی کہیں۔ یہ چال قدرتی نہ ہوتی۔

موقعۂ واردات سے تھوڑا ہی آگے کھڈ شروع ہو جاتے تھے۔ کھوجی نے مجھے وہاں بتایا کہ مرد کا جو کھُرا ہے وہ ان کھڈوں کی طرف سے آیا ہے۔ میں نے وہ کھُرے بھی دیکھے جو کھڈوں کی طرف سے آتے تھے۔ وہ یہی کھُرا تھا جو عورت کے ساتھ تھا۔ میں نے ان کھُروں کے مولڈ تیار کرنے کی ہدایت جاری کر دی۔ صرف کھُروں سے ہی مجھے سراغ نہیں لینا تھا۔ میرے پاس اور ذرائع بھی تھے۔ میں آپ کو پہلی کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ پولیس کے لیے مُخبری کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ ان میں چرسیوں اور بھنگیوں کے علاوہ شہر کے معززین بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ خوشامد کا ایک طریقہ ہوتا ہے جو پولیس کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔

میں وہاں سے چلنے لگا تو ایسے دو معززین میرے ساتھ چل پڑے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ واردات سے متعلق کوئی بات بتائیں گے۔ میں نے خود ہی ان سے پوچھا کہ یہ واردات کیسی ہے۔

"بختیار (زخمی) ٹھیک آدمی نہیں"۔۔۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔۔۔ "اس کے ساتھ ایک نہ ایک دن ایسے ہونا ہی تھا.....

آوارہ آدمی ہے۔"

"ذرا کھل کر بتائیں کہ اس میں کیسی آوارگی ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "اور وہ اگر ٹھیک نہیں تو اس میں کیا خرابی ہے۔"

اِن دونوں نے باری باری بولنا شروع کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کو لُقمے دیتے رہے اور جو بات میرے سامنے آئی وہ یوں تھی کہ بختیار کی بیوی اچھی لڑکی تھی۔ اگر سانولا رنگ نقص ہے تو یہ نقص اس میں موجود تھا۔ اُس کے نقش اچھے تھے۔ اُس میں ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ شریف خاندان کی لڑکی تھی۔ اُس کے دو بڑے بھائی تھے۔ باپ بھی تھا۔ یہ اپنی عزت کو بچائے رکھنے والے لوگ تھے۔

بختیار نے اس لڑکی میں شادی کے بعد ذرا سی بھی دلچسپی نہ لی۔ دوسرے محلّے میں بختیار کے رشتہ داروں کا ایک گھرانا تھا۔ اس کی دو بہنیں جوان تھیں۔ دونوں خاصی خوبصورت تھیں اور اُن کی رنگت گوری تھی۔ ان بہنوں کے دو بھائی بھی تھے۔ ایک کی عمر چودہ پندرہ سال اور دوسرے کی سترہ اٹھارہ سال تھی۔ یہ دونوں اپنی بہنوں کی طرح گورے چٹے اور خوبصورت تھے۔ اُن کے جسم اور ان کی خوبصورتی زنانہ قسم کی تھی۔ ان کی ماں کھانے پینے والی عورت تھی۔ یہ لڑکیاں خراب تو نہیں تھیں لیکن بختیار کی وجہ سے بدنام ہو گئیں۔

بختیار نے شادی کی تو چار پانچ مہینے گزرے ہوں گے کہ اُس نے اس گھر میں آنا جانا شروع کر دیا۔ رات کو بھی وہاں جانے لگا۔ پھر رات دیر تک اس گھر میں رہنے لگا۔ کبھی ہو نہیں سکتا کہ لوگ ٹوہ نہ لگائیں اور باتیں نہ کریں۔ دونوں بہنیں تو بدنام نہیں تھیں، ان کی ماں کو محلے برادری والے اچھی عورت نہیں سمجھتے تھے۔ لوگوں نے اس قسم کی باتیں مشہور کر دیں کہ بختیار بڑی بہن کے پاس جس کا نام انوری تھا، جاتا ہے اور انوری کی ماں نے بختیار سے کہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور انوری کے ساتھ شادی کر لے۔

بختیار کا کاروبار بڑا اچھا تھا۔ آمدنی بہت تھی۔ لوگوں کے کہنے کے مطابق اُس کی آمدنی کا اچھا خاصا حصّہ ان لڑکیوں کی ماں ہضم کر رہی تھی۔ بختیار کی بیوی اکثر اپنے ماں باپ کے گھر رہتی تھی۔ بختیار نہ کبھی اُس کے ساتھ گیا نہ کبھی اُسے اپنے گھر لانے کو گیا۔ شادی کو دو سال ہونے کو آئے تو بختیار نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ بختیار انوری کے ساتھ شادی کرے گا لیکن دن گزرتے چلے گئے بختیار نے شادی نہ کی۔ ایک بات یہ بھی مشہور ہوئی کہ بختیار بڑی کی بجائے چھوٹی بہن کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ چھوٹی بہن کا نام راحیلہ تھا۔ آخر یہ دن آگیا کہ بختیار پر کسی نے حملہ کیا۔ طلاق اور قاتلانہ حملے میں تقریباً ایک سال کا وقفہ تھا۔

"کیا بختیار کی بیوی کے بھائی یا قریبی رشتے کے مرد اتنے دلیر ہیں کہ انہوں نے طلاق کا انتقام لیا ہو؟"

"نہیں" ــــ مجھے جواب ملا ــــ "اُن میں اتنی ہمت ہوتی تو طلاق کے فوراً بعد انتقام لے لیتے۔ انہوں نے باتیں تو بہت کی تھیں لیکن کچھ کر نہیں سکے تھے نہ کچھ کرنے کی اُن میں طاقت تھی۔"

وہ ہوش میں آگیا

یہ دونوں معزّزین بولتے جا رہے تھے۔ میں بظاہر سُن رہا تھا لیکن میں دراصل سوچ رہا تھا۔ بختیار کی بیوی کے لواحقین کو میں نے ذہن سے اتار دیا تھا۔ یہ صحیح تھا کہ انہیں اگر انتقام لینا ہوتا تو بہت پہلے لے چکے ہوتے۔ میں نے ان دونوں آدمیوں کی باتیں سُن لیں لیکن یہ سب سنی سنائی تھی۔ میں اُن کی ہر بات کو سچ نہیں مان سکتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ لوگ رائی کا پہاڑ اور بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔ سکینڈل گھڑنا ہمارے معاشرے کا بہت بڑا ہنر ہے اور یہی تفریح ہے۔ پھر بھی میں ان دونوں آدمیوں کا ممنون تھا کہ انہوں نے مجھے بڑا قیمتی سراغ دے دیا تھا۔ میرے پاس شاملِ تفتیش کرنے کے لیے کچھ افراد آگئے تھے۔ یہ انوری اور راحیلہ کے دونوں بھائی تھے۔ ان پر مجھے یہ شک ہُوا کہ، جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا، اُن کا یارانہ بدمعاشوں کے ساتھ تھا۔ ایسا امکان موجود تھا کہ ان دونوں میں غیرت جاگ اٹھی ہو اور انہوں نے اپنے بدمعاش دوستوں سے بختیار پر حملہ کرایا ہو۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ ان بھائیوں نے بختیار کو اپنی کسی بہن کے ساتھ نازیبا حرکتیں کرتے دیکھا ہو۔ میرا یہ شک بڑا ہی کمزور تھا کیونکہ ان لڑکوں کے چال چلن اور جسمانی حالت کے متعلق مجھے جو کچھ بتایا گیا تھا، اس کے پیشِ نظر ان دونوں میں اتنی غیرت اور جرأت نہیں ہونی چاہیے تھی۔

میں جب تھانے کے قریب پہنچا تو یہ دونوں معزّزین مجھ سے رخصت ہو گئے۔ تھانے میں داخل ہوتے ہی مجھے اطلاع ملی کہ زخمی جسے پولیس کی اصطلاح میں مضروب کہا جاتا ہے، ہوش میں آگیا ہے۔ میں وہیں سے

ہسپتال کو دوڑ پڑا۔ ہسپتال قریب ہی تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو ساتھ لیا اور مضروب کے پاس جا بیٹھا۔ اُسے جو تازہ خون دیا گیا تھا، اس کی کچھ سُرخی اُس کے چہرے پر آگئی تھی۔ آدمی جوان اور خوبرو تھا۔ مجھے اُس کا آدھا چہرہ نظر آرہا تھا۔ جس طرف ماتھے اور آنکھ پر زخم تھا، وہ تمام چہرہ پٹیوں میں چُھپا ہُوا تھا۔ اُس کی جو آنکھ صحیح تھی، وہ اُس نے ذرا سی کھولی۔ میں نے ہمدردی اور شفقت کے لہجے میں اُس سے پوچھا کہ وہ کچھ بہتر محسوس کر رہا ہے یا نہیں۔ میں نے اُسے تسلی اور دلاسہ دیا اور پوچھا کہ وہ بیان دینے کے قابل ہے یا نہیں۔ اُس نے سر ہلایا کہ وہ بیان دے گا۔

"کیا تم پرچہ چاک کرانا چاہتے ہو؟" میں نے بختیار سے پوچھا۔

"ہاں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "پرچہ تو میں ضرور کراؤں گا۔ جس نے مجھ پر حملہ کیا ہے وہ تو دراصل مجھے قتل کر گیا تھا۔"

"کون تھا وہ؟"

"معلوم نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

"کسی پر شک؟"

"نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

وہ نحیف آواز میں بول رہا تھا۔ اُسے بولنے میں کچھ دقّت سی محسوس ہوتی تھی۔ اسی لیے میں اس کوشش میں تھا کہ زیادہ سے زیادہ مختصر بات پوچھوں اور وہ بھی مختصر جواب دے۔ اب تو مجھے بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ زندہ رہے گا۔

"بختیار بھائی!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میں تم سے زیادہ باتیں نہیں کراؤں گا۔ خود ہی بتا دو کہ تم پر یہ واردات کیسے ہوئی۔"

"مجھے خود پتہ نہیں چلتا کہ مجھ سے کسی نے کیا لینا تھا" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں گھومنے پھرنے کے لیے کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ میں گھوما تو میرے ماتھے پر کلہاڑی پڑی۔ میں چکرا گیا۔ اس کے بعد مجھے اتنا

ہی یاد ہے کہ کلہاڑی کا دوسرا وار میرے کندھے پر پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری ہنسلی کٹ گئی ہے۔ پھر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے اپنے گرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔"

"تم نے اُس آدمی کو دیکھا تو ہوگا"۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔

"بے شک آج کل راتیں اندھیری ہیں لیکن اندھیرے میں بھی قریب کھڑے آدمی کے قدوقامت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اُس کا قد کیسا تھا؟ جسم بھاری تھا یا دبلا پتلا یا کوئی ایسی نشانی جو تمہیں نظر آئی ہو۔"

"کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ اُس کا قد مجھ سے کچھ کم ہی تھا"۔۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔۔ "اس سے زیادہ میں کچھ نہیں دیکھ سکا کیونکہ پیچھے کو مڑتے ہی کلہاڑی میرے ماتھے پر آ لگی۔"

"کیا تم اپنے سسرال کے کسی آدمی پر یا اپنی مطلقہ بیوی کے بھائیوں پر شک نہیں کرو گے؟"

"اگر وہ اتنی جرأت اور اتنی طاقت والے ہوتے تو میں ان کی لڑکی کو طلاق دینے کی کبھی جرأت نہ کرتا"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔۔ "اُن کے دلوں میں میری اتنی دشمنی ہوگی کہ وہ میری موت کی دعائیں کرتے ہوں گے لیکن نہ میں اُن پر شک کرتا ہوں نہ آپ انہیں مشتبہ سمجھیں۔ انہیں اپنے دماغ سے نکال دیں۔"

بختیار سے مجھے بہت کچھ پوچھنا تھا لیکن میں نے اس سے زیادہ اُس کا بیان نہ لیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُس پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی اور کمزوری اتنی کہ وہ بڑی مشکل سے بولتا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ دو معززین نے مجھے بختیار کے چال چلن کے متعلق جو کچھ بتایا تھا، اس کی تصدیق بختیار سے نہیں کرائی جا سکتی تھی۔ یہ پس منظر مجھے دوسروں سے معلوم کرنا تھا۔ میں نے اُس کا جو بیان قلمبند کیا تھا وہ اُسے پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر نے اُس سے پوچھا کہ اُس کے بیان میں کوئی چیز غلط یا فالتو تو نہیں لکھی گئی؟ اُس نے کہا کہ اُس کا بیان بالکل صحیح قلمبند کیا گیا ہے اور وہ

اس سے زیادہ کچھ نہیں کہے گا۔ میرے کہنے پر اُس نے اپنے بیان پر دستخط کر دیے۔ پھر ڈاکٹر نے اس بیان کے نیچے لکھا کہ یہ بیان اُس کی موجودگی میں ریکارڈ کیا گیا ہے اور اس میں وہی کچھ لکھا ہے جو مضروب نے کہا ہے اور یہ بھی کہ بیان دیتے وقت مضروب پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔

دونوں بھائی اپنی بہنوں جیسے تھے

بختیار کا باپ اور بھائی وارڈ کے باہر بیٹھے تھے۔ میں نے اُن سے بھی پوچھا کہ وہ پرچہ کرانا چاہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اُن کے نام سے مقدمہ درج کیا جائے۔ میں نے ان سے ایک بار پھر پوچھا کہ جس کسی پر انہیں معمولی سا بھی شک ہے اُس کا نام پتہ دے دیں۔ انہوں نے کہا کہ انہیں کسی پر شک نہیں۔

"کیوں پہلوان!" ــــ میں نے بختیار کے بڑے بھائی سے کہا ــــ "تمہارے ذہن میں کوئی آدمی ہے جس کے متعلق تم نے کہا تھا کہ مجھے اُس کی لاش ملے گی۔ کیا اب اُس کا نام بتاؤ گے؟"

"میرا شک بختیار کے سالوں پر تھا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "لیکن اب جب پتہ چلا ہے کہ بختیار کو خدا نے زندگی دے دی ہے تو میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا ہے کہ وہ لوگ اتنی جرأت نہیں کر سکتے۔ اب میرا کسی پر بھی شک نہیں۔"

میں ان دونوں کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔

"بڑے میاں!" ــــ تھانے میں بختیار کے باپ کو اپنے سامنے بٹھا کر میں نے اس سے کہا ــــ "اب مجھے یہ نہ کہنا کہ تمہارا بیٹا شریف آدمی ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اُس نے اپنی بیوی کو طلاق کیوں دی تھی؟... تمہارے جواب سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں یہ بات تسلیم نہیں کروں گا کہ وہ لڑکی بدچلن تھی، اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تمہارے بیٹے کا چال چلن صحیح نہیں تھا..... اب کہو کیا کہتے ہو؟"

باپ کا سر جھک گیا۔ میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس نے سر اٹھایا تو میں نے اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

"میرے اس بیٹے نے میری عزت خاک میں ملا دی ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ اس کی بیوی اچھی لڑکی تھی۔ میری اور میری بیوی کی اُس نے اپنی بیٹیوں کی طرح خدمت کی ہے۔ ہمیں اس لیے بھی اچھی لگتی تھی کہ اپنے خون کے رشتے کی لڑکی ہے مگر بختیار نے اُسے دل سے قبول ہی نہیں کیا۔"

"کیا وہ کسی اور جگہ پھنس گیا تھا؟"

"بات کچھ ایسی ہی تھی" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "ہمارے رشتے داروں میں انوری اور راحیلہ نام کی دو لڑکیاں ہیں۔ ایک تو وہ خوبصورت ہیں، دوسرے ان کی ماں بہت چالاک ہے۔ مردوں کو پھانسنے کی ماہر ہے۔ بختیار اُن کے جال میں پھنس گیا تھا۔"

"شادی سے پہلے یا بعد؟"

"میرا خیال ہے کہ شادی کے بعد اُس نے اُن کے گھر جانا شروع کیا تھا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میرے کانوں تک باتیں پہنچتی رہیں کہ وہ چڑیل اپنی ایک بیٹی بختیار کو دے رہی ہے اور اسے کہتی ہے کہ بیوی کو طلاق دے دو۔ وہ دراصل بختیار کی کھال اتار رہی ہے۔ میں نے اور میرے بڑے بیٹے نے بختیار کو سمجھانا چاہا تو اُس نے ہماری بے عزتی کر دی۔ پھر اس نے اپنی ماں کو دھمکی دی کہ اُس کے ساتھ پھر کبھی ایسی بات کی گئی تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کے بعد ہم نے بھی اُس کے ساتھ بات کرنے کی جرأت نہ کی کیونکہ اُس نے اپنی عادتیں بدمعاشوں جیسی بنا لی تھیں۔ پھر اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اس بدمعاش عورت کا مرید ہو کر رہ گیا۔ میں نے ایک روز اُسے کہا کہ تم اگر انوری یا راحیلہ کے ساتھ ہی شادی کرنا چاہتے ہو تو کر لو لیکن اُس نے مجھے کوئی دو ٹوک جواب نہ دیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ بڑی کے ساتھ

شادی کروں یا چھوٹی کے ساتھ۔"

یہ مختصر سے سوال اور جواب ہیں جو میں نے آپ کو سُناتے ہیں۔ میں نے اس شخص سے بے انداز باتیں پوچھی تھیں۔ اس سے مجھے کام کی صرف یہ بات معلوم ہوئی کہ بختیار بہت بُرے چال چلن کا آدمی ہے اور یہ بھی کہ اس کا یارانہ دوسری عورتوں کے ساتھ بھی ہوگا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بختیار پر جو قاتلانہ حملہ ہُوا ہے یہ انتقامی کارروائی ہے۔ اُس نے کسی کی بہو بیٹی پر ہاتھ ڈالا ہوگا اور اُنہوں نے اُسے اُلٹا دیا۔

باپ کو باہر بھیج کر میں نے بختیار کے بڑے بھائی کو بلایا۔ اُسے بھی کہا کہ وہ بختیار کو شریف آدمی نہ کہے اور یہ بھی نہ کہے کہ اُس کی بیوی اچھی نہیں تھی۔ پھر میں نے اُسے تفتیش کی چکّی میں ڈال دیا۔ اب یہ شخص صحیح طریقے سے بول رہا تھا۔ اُس نے جو بیان دیا وہ اُس کے باپ کے بیان کی تصدیق کرتا تھا۔

"مجھے شک ہے کہ بختیار کے تعلّقات دوسری عورتوں کے ساتھ بھی تھے"۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔ "اگر تمہیں معلوم ہے تو بتا دو۔ میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ اُس پر قاتلانہ حملہ اسی چکّر میں ہُوا ہے۔"

"سچی بات ہے کہ میرا یہ بھائی اسی قماش کا ہے"۔۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔۔ "شادی سے پہلے اُس نے ایک ہندو عورت کے ساتھ یارانہ لگا رکھا تھا۔ پھر ایک مسلمان عورت کے ساتھ اُس نے میل ملاقات شروع کر دیا۔ ہم نے اسے اس طرح جھک مارتے پھرنے سے باز رکھنے کے لیے اُس کی شادی کی تھی۔ یہ تو شادی کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ جب شادی ہوئی تو یہ ایک اور عورت کے جال میں پھنس گیا جس کی دو جوان اور خوبصورت بیٹیاں ہیں۔ یہ شادی سے پہلے چالیس میل دُور طوائف بازی کے لیے بھی جایا کرتا تھا۔"

"جن عورتوں کے ساتھ بختیار کے تعلّقات رہے ہیں یا اب تک ہیں، کیا اُن میں سے کسی کا خاوند یا ایک دو بھائی اتنی غیرت اور جرأت والے ہیں کہ انہوں نے بختیار کو قتل کرنا چاہا ہو؟"۔۔۔۔ میں نے پوچھا۔

بختیار کے بھائی نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا کہ ان سب میں اُسے ایسا کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔

"یہ جوانوری اور راحیلہ ہیں"۔۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔۔ "ان کے دو بھائی ہیں۔ اُن کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"وہ بھی لڑکیاں ہی ہیں"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"تم نے یہ نہیں سوچا کہ ان لڑکوں کا یارانہ بدمعاشوں کے ساتھ ہے؟"۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔ "کیا وہ اپنے ان بدمعاش دوستوں سے بختیار کو قتل یا زخمی کرانے کا انتظام نہیں کر سکتے؟"

"آپ تھانیدار ہیں"۔۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔۔ "جہاں تک آپ کا دماغ پہنچ سکتا ہے وہاں تک میں نہیں سوچ سکتا۔ یہ خیال ضرور آتا ہے کہ یہ بھائی اتنی غیرت والے ہوتے تو اُن کا اپنا چال چلن صحیح ہوتا اور اگر ان میں غیرت ہوتی تو بہت پہلے بختیار پر حملہ کرا چکے ہوتے۔"

اس شخص سے مجھے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی۔

عورت واقعی چالاک تھی

یہ کیس ایسا تھا جس کی تفتیش میں میرے مخبر ہی میری مدد کر سکتے تھے۔ میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ اس کیس کے مطابق مخبروں کو تھانے بلا لے... یہ ایک انسانی مشینری ہوتی تھی جو اکثر اوقات کسی حکم اور ہدایت کے بغیر کام کرنے لگتی تھی۔ میں نے گزشتہ رات جاگتے گزاری تھی۔ اب اگلی رات کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ جسم شل اور دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ میں اپنے گھر گیا۔ کھانا کھایا اور سو گیا۔

صبح کی اذانوں پر میری آنکھ کھلی۔ میں جلدی جلدی تیار ہوا اور ناشتہ کر کے تھانے گیا۔ تین مخبر کانسٹیبلوں کی بارک میں سوئے ہوئے تھے۔ انہیں جگا کر اپنے دفتر میں بٹھا لیا۔ انہوں نے بختیار کے چال چلن کے متعلق وہی کچھ بتایا جو اُس کے باپ اور بھائی سے معلوم ہو چکا تھا۔ انہوں نے مزید یہ بتایا کہ وہ عورتوں کے معاملے میں شاہ خرچ تھا۔ اُن سے اور کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ میں نے کہا کہ مجھے تمام معلومات درکار ہیں اور جو آدمی بختیار کو اور اُس کے دوستوں اور دشمنوں کو اچھی طرح جانتا ہو اُسے تھانے لے آئیں۔

میرے ذہن میں اُس عورت کا کھُرا اٹکا ہُوا تھا جو ایک مرد کے کھُرے کے ساتھ دیکھا تھا۔ کھوجی نے بختیار کی جُوتی کا تلا دیکھ لیا تھا۔ یہ مردانہ کھُرا بختیار کا نہیں تھا۔ یہ کوئی اور شخص تھا۔ حملے کا ملزم یہ شخص ہو سکتا تھا، لیکن یہ عورت کون تھی؟

میرا ذہن گھوم پھر کر انوری اور راحیلہ پر آ کر اٹک جاتا تھا۔ میرا یہ شک پختہ ہو رہا تھا کہ انوری یا راحیلہ کا امیدوار کوئی اور ہو گا۔ اُس نے بختیار

کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہو گی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ان دونوں بہنوں میں سے کوئی ایک بختیار کو پسند نہ کرتی ہو اور اُس کی ماں بختیار کو اُس پر مسلّط کر رہی ہو۔ اِس لڑکی نے اپنے کسی چاہنے والے سے کہا ہو گا کہ بختیار کو راستے سے ہٹاؤ۔

یہ سب قیافے اور قیاس تھے۔ اگر موقعۂ واردات پر عورت کا کھُرا نہ ہوتا تو میں اس شک پر تفتیش کرتا کہ یہ شخص بدقماش تھا اور کسی بدقماش کے ہاتھوں زخمی ہُوا ہے۔ غور کرتے کرتے میرا یہ احساس پختہ ہوتا گیا کہ انوری اور راحیلہ کو شاملِ تفتیش کرنا پڑے گا۔ میں ہمیشہ خیال رکھا کرتا تھا کہ کسی مسلمان عورت کو تھانے بلانا ٹھیک نہیں۔ میں مسلمانوں کے گھروں میں چلا جایا کرتا تھا لیکن جب کسی کے سینے سے کوئی سراغ یا راز نکالنا ہوتا تھا تو اُسے تھانے بلا لیتا تھا۔ تھانے کا خوف میرا کام آسان کر دیا کرتا تھا۔ ان دونوں لڑکیوں اور ان کی ماں کو میں نے تھانے بلانا بہتر سمجھا۔ میں نے انہیں بلانے کے لیے بغیر وردی کا کانسٹیبل کو بھیجا۔

وہ کالے برقعوں میں آئیں۔ اُن کی ماں سفید برقعے میں اُن کے ساتھ تھی اور ایک بھائی بھی ساتھ آیا تھا۔ میں نے چاروں کو اپنے دفتر میں بٹھایا۔ برقعوں کے نقاب چہروں پر گرے ہُوئے تھے۔ لڑکیوں کے بھائی کو میں نے غور سے دیکھا۔ انیس بیس سال کا نوجوان تھا۔ جسم دبلا پتلا، گردن لمبوتری، رنگ گورا اور نقش بہت اچھے تھے۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ کا یہ عالم تھا جیسے ابھی رو پڑے گا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کا باپ کہاں ہے؟ اُس نے بتایا کہ دکان پر چلا گیا ہے۔ ان کی کپڑے کی دکان تھی۔

میں نے ان چاروں سے کہا کہ وہ ڈریں نہیں۔ اُن پر کوئی الزام نہیں۔ ان سے کچھ پوچھنا ہے، پھر میں انہیں پوری عزّت سے رخصت کروں گا۔

"آپ بختیار کے سلسلے میں ہم سے کچھ پوچھیں گے؟"—— لڑکیوں کی ماں نے پوچھا۔

"یہی سلسلہ ہے" ـــــ میں نے جواب دیا ـــــ "اُس کا آپ کے گھر آنا جانا تھا۔ مجھے اُس شخص کو پکڑنا ہے جس نے بختیار کو تو قتل ہی کر دیا تھا لیکن اللہ نے اُسے بچا لیا ہے۔"

"ہم سے آپ کیا پوچھیں گے؟" ـــــ ماں نے کہا ـــــ "ہمارے گھر تو وہ ضرور آتا تھا لیکن اُس کی کسی کے ساتھ اگر باہر دشمنی تھی تو ہم کیا بتا سکتی ہیں؟"

"میں نے آپ سے کہا ہے کہ آپ ڈریں نہیں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "آپ کا اس واردات میں ہاتھ نہیں۔ میں آپ کا مسلمان بھائی ہوں۔ آپ کی عزّت کا پُورا خیال رکھوں گا۔"

عورت واقعی چالاک تھی اور زبان کی تیز معلوم ہوتی تھی۔ کہنے لگی ـــــ "ہماری عزّت رہ ہی کہاں گئی ہے جس کا آپ خیال رکھیں گے۔ کسی عورت کا تھانے بُلوائے جانا عزّت افزائی تو نہیں۔ محلے کے لوگ جانے کیسی کیسی باتیں بنائیں گے۔"

میں نے اُسے سمجھا بجھا کر کہا ـــــ "اپنی عزّت آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ اور آپ کی بیٹیاں میرے سوالوں کا صحیح صحیح جواب دیں گی تو آپ عزّت سے رخصت ہوں گی .... آپ بڑی بیٹی کو یہیں بیٹھا رہنے دیں اور باقی سب باہر بیٹھیں۔ میں آپ کو الگ تھلگ بٹھانے کا انتظام کر دیتا ہوں۔"

انوری عصمت لُٹا بیٹھی

بڑی بیٹی انوری میرے پاس رہ گئی۔ اُس نے برقعے کا نقاب اٹھا دیا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اُس کی خاطر آدمی قاتل بھی ہو سکتا تھا اور مقتول بھی۔ میں نے اُس کا خوف اور حجاب ختم کرنے کے لیے اُسے ہمدردانہ لہجے میں بہت کچھ کہا اور خبردار بھی کیا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرے۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ وہ مجھے جو کچھ بھی بتائے گی وہ میں لکھوں گا نہیں اور کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ اُس نے مجھے کیا بتایا ہے۔

"مجھے بہت سی باتوں کا علم ہے" ـــــ میں نے اُسے کہا ـــــ "پولیس کے پاس گھر گھر کی خبر ہوتی ہے۔ کسی کے گھر کی کوئی بات چھپی ہوتی نہیں ہوتی۔ اگر تم کچھ چھپاؤ گی یا جھوٹ بولو گی تو مجھے پتہ چل جائے گا۔ اگر سچ بولو گی تو میں تمہارا پردہ قائم رکھوں گا۔ جہاں میں نے محسوس کیا کہ تم مجھے دھوکے میں رکھنے کی کوشش کر رہی ہو تو میں پولیس والا سلوک کروں گا، پھر تمہیں بہت پریشانی ہو گی .... مجھے یہ بتا دو کہ بختیار نے

تمہارے ساتھ ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

وہ خاموش رہی اور میرے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"اُس نے تمہاری خاطر اپنی بیوی کو طلاق دی تھی"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "وہ تمہارے گھر آتا رہا پھر شادی کیوں نہ ہو سکی؟"

وہ پھر بھی خاموش رہی۔ اب اُس نے سر جھکا لیا۔

"انوری!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تمہیں جواب تو دینا ہی پڑے گا۔ جتنی جلدی بولو گی اتنی جلدی تھانے سے نکلو گی۔ تمہاری خاموشی بتا رہی ہے کہ تم کچھ چھپا رہی ہو... کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری ماں نے بختیار سے کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور تمہارے ساتھ شادی کر لے؟"

اُس نے سر ہلا کر بتایا کہ یہ سچ ہے۔

"کیا تم نے بختیار کو پسند کر لیا تھا؟"

اب اس کے منہ سے بڑی دھیمی سی "جی" نکلی۔

"تمہارے رشتے کا کوئی اور امیدوار بھی تھا؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "میرا مطلب ہے کہ کسی اور کے ساتھ تمہاری بات پکّی ہو چکی تھی؟"

"میری ماں تو تین لڑکوں کے ساتھ میری بات پکّی کر چکی تھی"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "لیکن وہ میرا رشتہ بختیار کو دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔"

مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ انوری کے اور امیدوار تھے یا نہیں۔ انوری نے ایک کی بجائے تین بتا دیئے۔

"کیا ان تین میں سے تم کسی کو پسند کرتی تھیں؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

وہ پھر جھینپ گئی۔ میں نے بہت سی باتیں کہہ سُن کر اُس کی جھجک دُور کی۔ بہت دماغ سوزی کرنی پڑی۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ یہ ساری باتیں آپ کو سُناؤں۔ آپ کو کام کی بات یہ سُناتا ہوں کہ میں نے اپنی

زبان کا جادو چلا کر اُس کی زبان کھلوا لی۔

"وہ مر جاتا تو میں خوش ہوتی"۔۔۔ انوری نے کہا۔۔۔ "اُس نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔"

اُس نے بتایا کہ بختیار نے اُسے یوں دھوکہ دیا تھا کہ بختیار ان کا قریبی رشتہ دار تھا اس لیے وہ اس سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ بختیار نے شادی کے بعد انوری کے گھر آنا شروع کر دیا۔ وہ خوبرو آدمی تھا اور ہنس مکھ بھی۔ اُس نے انوری کی ماں کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لی اور اُسے تحفے دینے لگا۔ انوری کو یہ شخص اچھا لگنے لگا۔ یہ موقع شاید ماں نے پیدا کیا ہو گا کہ بختیار انوری کو الگ کمرے میں لا۔ اُس نے انوری سے کہا کہ وہ اُسے دل وجان سے چاہتا ہے مگر اُس کی شادی ایسی لڑکی سے کر دی گئی ہے جو اُس کے جذبات کا خیال نہیں رکھتی۔ اُسے معلوم ہی نہیں کہ جذبات ہوتے کیا ہیں۔

اس طرح وہ جب بھی انوری کے گھر آتا تو انوری کی ماں کے منہ میں ہڈی دے کر انوری کو الگ کمرے میں بٹھا لیتا۔ وہ روحانی محبّت کا اظہار کرتا اور اپنی بیوی کا رونا روتا۔ انوری اُس کی غمخوار بن گئی۔ راحیلہ یہ ملاقاتیں دیکھ رہی تھی لیکن وہ خوش تھی کہ اس کی بہن کو بڑا اچھا رشتہ مل رہا ہے۔

انوری جو کچھ دیر پہلے تک جھینپ اور جھجک رہی تھی، اب کھل کر بولنے لگی۔ جس طرح مشاعرے میں کسی فضول سے شاعر کو داد دینی شروع کر دو تو وہ ایک کے بعد دوسری نظم سناتا چلا جاتا ہے، اسی طرح میں انوری کی حوصلہ افزائی ایسے طریقے سے کرتا رہا کہ اُس کی زبان بے قابو ہو گئی۔ اُس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ انوری کے جذبات کو بختیار نے بُری طرح کچل ڈالا تھا۔ انوری نے یہ غبار بھی نکالنا شروع کر دیا۔

"میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی تھی۔ مجھے ایسا خاوند مل رہا تھا جو میری پسند کا خاوند تھا"۔۔۔ انوری نے کہا۔۔۔ "مجھ پر اُس کی محبت جادو بن کر طاری ہو گئی تھی۔ میں اُس کی معمولی سی بات کو بھی حکم سمجھتی

تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب میں تمہارے پاس ہوتا ہوں تو مجھے دونوں جہان بھول جاتے ہیں۔ وہ ایسی باتیں کرتا تھا جو میرے دماغ پر قبضہ کر لیتی تھیں اور میں اُسی کی ہو کے رہ جاتی تھی....

"ایک رات ہم دونوں الگ کمرے میں حسبِ معمول تنہا بیٹھے تھے۔ ہم پر جذبات کا غلبہ تھا۔ ہم دونوں تنہائی میں ایک دوسرے سے ہٹ کر بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے، مگر اُس رات ہم ایک دوسرے میں اس حد تک تحلیل ہو گئے کہ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہُوا کہ میں بختیار کی بیوی بن چکی ہوں۔ اس کے بعد ہماری تنہائی کی ملاقاتیں حیوانی جذبات کے غلبے میں ہوئیں۔ ہمارا صرف نکاح پڑھنا باقی رہ گیا تھا۔ آپ نے پوچھا تھا کہ اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دی تو ایک سال بعد تک بھی اُس نے میرے ساتھ شادی کیوں نہیں کی۔ اب میں آپ کو اس کی وجہ بھی بتا دیتی ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ جس محبّت کا تعلق جسمانی ہوتا ہے وہ محبّت روحانی محبّت کے لیے زہر ہوتی ہے۔ پانچ چھ مہینوں بعد مجھے پتہ چلا کہ اب بختیار میری چھوٹی بہن میں دلچسپی لے رہا ہے۔ میں نے ماں کو بتایا۔ ماں نے کوئی خاص توجّہ نہ دی۔ میں نے خود اپنی بہن سے بات کی۔ بہن نے مجھے ہنس کر ٹال دیا....

"ہمارا مکان اس قسم کا ہے کہ اس میں کمرے زیادہ ہیں۔ دو کمروں کے دروازے باہر کو کھلتے ہیں۔ راحیلہ چونکہ ضدی لڑکی ہے، اس لیے ضد کر کے اُس نے پہلے ہی اپنا کمرہ الگ کر رکھا تھا۔ مجھے دو تین مہینے بعد پتہ چلا کہ بختیار رات کو باہر سے آتا ہے اور راحیلہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ محبّت پاک ہو ہی نہیں سکتی۔ راحیلہ کے ساتھ میرا لڑائی جھگڑا بھی ہُوا۔ پھر ہماری بول چال بند ہوئی۔ میری ماں نے راحیلہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ یہ اُن تحفوں اور پیسوں کا فتور تھا جو بختیار ہمارے گھر میں پھینکتا رہتا تھا۔ میری بول چال بختیار کے ساتھ بھی بند ہو چکی تھی....

"اپنا آپ لٹا کر مجھے پتہ چلا کہ بختیار عورتوں کا شکاری ہے کسی

کی کوئی ایسی ویسی حرکت چھپی نہیں رہ سکتی۔ مجھے دو عورتوں سے پتہ چلا کہ بختیار کے تعلقات دو تین اور عورتوں کے ساتھ بھی ہیں۔ اب میں یہ نہیں سوچتی تھی کہ راحیلہ نے مجھ سے میرا ہونے والا خاوند چھین لیا ہے بلکہ میرے سامنے مسئلہ یہ آ گیا تھا کہ اپنی بہن کو اس شیطان فطرت انسان سے کس طرح بچاؤں لیکن راحیلہ اندھی ہو چکی تھی۔ اندھی تو میں خود بھی ہو گئی تھی۔ جب میری آنکھیں کھلیں تو مجھے پتہ چلا کہ ہم دونوں بہنیں سارے شہر میں بدنام ہو چکی ہیں....

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے رشتے کے امیدوار تین تھے۔ ان میں دو کو تو ہم کسی شمار قطار میں شامل نہیں کرتے تھے، البتہ ایک ہے جو مجھے بھی اچھا لگتا تھا اور میری ماں بھی اُسے پسند کرتی تھی۔ اُس کے ساتھ بات تقریباً پکی ہو چکی تھی لیکن بختیار کا آنا جانا شروع ہو گیا اور گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ جب میں بختیار کے پھندے میں پوری طرح پھنسی ہوئی تھی تو ہمارے رشتے کی ایک بزرگ عورت ایک روز میرے پاس آئی۔ اُس نے مجھے اس آدمی کا پیغام دیا کہ تم مجھے ٹھکرا دو لیکن اس آدمی (بختیار) کے جال سے بچو۔ یہ شخص بڑا گندہ کھلاڑی ہے۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ میری جو بات تم ذلیل اور خوار ہو کر سمجھو گی وہ اس سے پہلے آج ہی سمجھ لو....

"میری قسمت میں خدا نے ذلیل و خوار ہونا لکھ دیا تھا۔ میں مشتاق کی (جس نے پیغام بھیجا تھا) بات نہ سمجھ سکی۔ جب میں اپنا آپ لٹا چکی تھی اور بختیار میری بہن کا ہو کے رہ گیا تھا، ان ہی دنوں کا واقعہ ہے کہ میں ایک رات ایک شادی پر گئی۔ وہاں عورتوں اور مردوں کا بہت ہی ہجوم تھا۔ لڑکیاں ناچ کُود رہی تھیں۔ میں عورتوں اور مردوں کے ہجوم میں سے گزرتی ڈیوڑھی کی طرف جا رہی تھی تو میں مشتاق سے ٹکرا گئی۔ اُس نے سرگوشی میں مجھ سے حال احوال پُوچھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ حال بہت بُرا ہے۔ اُس نے سرگوشی میں ہی کہا — 'میرے پیچھے آؤ' — وہ دراصل وہاں شادی کے انتظامات میں مصروف تھا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ گلی

میں بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ میں دوپٹے کو چہرے پر لٹکا کر ان لوگوں میں سے نکل گئی۔ ایسے موقعوں پر کوئی کسی کو نہیں دیکھتا کہ یہ کون ہے اور وہ کدھر جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ میں مشتاق کے پیچھے ایک اندھیری گلی میں پہنچ گئی اور وہ رُک گیا....

"مشتاق نے پوچھا کہ حال کیوں بُرا ہے۔ میں نے اُسے یہ تو نہ بتایا کہ میں اپنی عزّت و آبرو بختیار کے قدموں میں پھینک چکی ہوں، میں نے یہ کہا کہ بختیار نے میرے ساتھ شادی کا وعدہ کیا تھا اور اب مجھے ٹھکرا کر میری بہن کے کمرے میں گھسا رہتا ہے۔ وہ دراصل میرے ساتھ شادی نہیں ناجائز تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے دھتکار دیا۔ اُس نے راحیلہ کے ساتھ وہی دوستی قائم کر لی جو وہ میرے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مشتاق کو بتایا کہ تم تو ہمارے ابّو کو جانتے ہو اور ہمارے بھائیوں کو بھی تم جانتے ہو۔ اُن میں اتنی جرأت اور ہمت نہیں کہ وہ بختیار کو گھر آنے سے روک سکیں۔ میں نے اور میری ماں نے اُسے گھر آنے سے منع کیا تو اُس نے ایسی دھمکیاں دیں کہ ہم خاموش ہو گئیں۔ میں نے مشتاق سے کہا کہ میں اور میری ماں بہت بُری حالت میں ہیں۔ بدنامی الگ ہو رہی ہے اور ہمارے گھر میں بدکاری الگ ہو رہی ہے۔ میں نے مشتاق سے جھوٹ بولا کہ میں نے اپنی عصمت تو محفوظ رکھی ہے لیکن میری بہن اُس سے بچ نہیں سکی۔ میں نے مشتاق سے کہا کہ میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ کہیں سے زہر مل جائے تو بختیار کو دے دوں....

"میں نے مشتاق کے ہاتھ پکڑ کر چُومے اور اسے اللہ کا واسطہ دے کر کہا کہ مجھے بخش دینا، میں نے تمہارے ساتھ شادی کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اگر میرے ماں باپ نہ مانے تو میں تمہارے پاس آجاؤں گی.... میں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ مجھے معلوم تھا کہ مشتاق مجھے بُری طرح چاہتا ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ جب تک بختیار کا ہمارے گھر میں آنا جانا بند نہیں ہوتا، کوئی شریف گھرانا ہمارے قریب نہیں آئے

گا۔ مشتاق نے بڑی دلیری سے کہا کہ میں اُس کا آنا جانا بند کروں گا...

"اس ملاقات کے تقریباً ایک ماہ بعد یہ واقعہ ہو گیا۔ میرے دل میں پہلا خیال یہ آیا کہ یہ مشتاق کا کارنامہ ہے"— اتنا کہہ کر وہ چونک کر چُپ ہو گئی اور اُس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔ ذرا دیر بعد گھبرائی ہوئی آواز میں بولی —"میں نے مشتاق کا نام لے کر غلطی کی ہے۔ آپ اُسے پکڑ لیں گے۔"

"کیا اس کے بعد مشتاق تمہیں ملا تھا؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا —"میں اُسے ملنا چاہتی تھی لیکن اس سے ملنا آسان نہیں تھا۔"

"دیکھو انوری!"— میں نے شفقت کے لہجے میں اُسے کہا — "تم نے میرے دل میں بختیار کی نفرت پیدا کر دی ہے۔ اُسے جس کسی نے مارا ہے بڑا ہی اچھا کیا ہے۔ ایسے ذلیل اور بدکار آدمی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اگر یہ کام مشتاق نے کیا ہے تو مجھے بتا دو تاکہ میں اسے سزا سے بچانے کا بندوبست کر لوں۔ یہ میرے اختیار میں ہے۔ گھبراؤ نہیں میں مشتاق کو گرفتار بھی نہیں کروں گا۔"

اُس کے چہرے پر رونق واپس آگئی لیکن اُس نے پھر وہی بات کہی کہ وہ مشتاق سے ملی نہیں، نہ اُس کا اُسے کوئی پیغام ملا ہے۔ انوری نے آگے ہو کر میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اُس کی دونوں آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے منّت کی کہ میں مشتاق کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں۔ میں نے پیار سے، ہمدردی اور شفقت سے اُس کے سینے سے اصل بات نکالنے کی پوری کوشش کر ڈالی لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ اُسے بالکل علم نہیں کہ مشتاق نے بختیار کو مارا ہے۔ بہت وقت صرف کر کے اور ہر طرح کی جھک جھک کے بعد میں یہ ماننے پر آگیا کہ انوری کو معلوم نہیں۔ بہرحال مجھے یہ خوشی ہوئی کہ ایک اور مشتبہ میرے سامنے آگیا ہے۔ میں نے باتوں باتوں میں انوری سے مشتاق کے گھر کا اتا پتہ معلوم کر لیا۔ میں نے اُسے کہا کہ ذرا باہر بیٹھو۔

انوری کا ایک مایوس امیدوار

میں باہر نکلا۔ تقریباً ساٹھ سال کی عمر کا ایک معزز سا آدمی کھڑا تھا۔ پتہ چلا کہ انوری کا باپ ہے۔ میں اُسے اپنے دفتر میں لے گیا۔ گورے رنگ کا یہ بوڑھا جوانی میں خاصا خوبصورت رہا ہوگا۔ اب تو اُس کے کندھے آگے کو آگئے اور سر جھک گیا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے اور بختیار جیسے آدمی کو اُس نے اپنے گھر میں آنے کی کھلی چھٹی کیوں دے رکھی تھی۔

اُس کی بے نور آنکھوں میں آنسو آگئے اور اُس نے سر جھکا لیا۔ میں نے اُسے بہت کچھ کہا۔

"میں مجبور ہوں جناب عالی!" — اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "میں اس عورت کے ہاتھوں سخت مجبور ہوں۔ میری بیٹیاں اتنی نیک اور شریف ہُوا کرتی تھیں کہ لوگ ان کی تعریف کیا کرتے تھے لیکن ماں نے انہیں بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ خدا نے مجھے جو بیٹے دیئے وہ نہ دیتا تو میں اتنا زیادہ رُسوا اور بدنام نہ ہوتا۔ اولاد اور اس کی ماں نے آج مجھے تھانے تک پہنچا دیا ہے۔"

اس بوڑھے پر مجھے بہت ترس آیا۔ مجھے اپنا کام کرنا تھا جس کی تکمیل کے لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس بوڑھے کی دلجوئی کے ساتھ ساتھ اپنے کام کی پوچھ گچھ بھی کرتا رہا۔ اس سے مجھے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی سوائے اس کے کہ بختیار کی بدمعاشی سے وہ ڈرتا تھا اور وہ اپنی بیوی سے بھی ڈرتا تھا۔

"کیا مشتاق نام کے ایک آدمی کے ساتھ آپ نے انوری کی بات پکّی کر دی تھی؟" — میں نے پوچھا۔

"مجھ پر ہوتا تو میں دونوں بیٹیوں کی بات کبھی کی پکّی کر کے انہیں رخصت کر چکا ہوتا" — بوڑھے نے جواب دیا — "مشتاق کے ساتھ بات پکّی ہو گئی تھی۔ ابھی منگنی نہیں ہوئی تھی کہ بختیار آن ٹپکا۔"

میرے پوچھنے پر اُس نے یہ بھی بتایا کہ مشتاق نے اُسے تین چار مرتبہ کہا تھا کہ اُس کے گھر میں بختیار کا آنا جانا اُس کی بے عزّتی کا باعث بن رہا ہے اور لوگ بڑی ننگی باتیں کرتے ہیں۔ بوڑھے نے اُسے کہا تھا کہ وہ بختیار کو گھر میں آنے سے روکے گا لیکن وہ نہیں روک سکا تھا۔

"مشتاق نے آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ اگر اجازت دیں تو وہ بختیار کو آپ کے گھر آنے جانے سے روک دے؟"

"آپ کو کس نے بتایا ہے؟" — بوڑھے نے حیرت سے پوچھا اور کہا — "یہ بات مشتاق نے مجھے دو مرتبہ کہی تھی۔"

"آپ نے اس کے جواب میں اُسے کیا کہا تھا؟"

"میں نے اُسے روک دیا تھا" — بوڑھے نے کہا — "میں نے اُسے کہا تھا کہ وہ بدمعاش آدمی تمہاری بے عزّتی کر دے گا۔"

"آخری بار مشتاق نے یہ بات کب کہی تھی؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا — "میرا خیال ہے کہ کوئی ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔"

"جب آپ نے مشتاق سے کہا تھا کہ بختیار اُس کی بے عزّتی کر دے گا تو مشتاق نے کیا کہا تھا؟"

"اُس نے کہا تھا، معلوم نہیں آپ لوگ اُس سے کیوں ڈرتے ہیں" — بوڑھے نے جواب دیا — "مشتاق نے کہا تھا کہ میں ایک منٹ میں بختیار کی بدمعاشی ہوا کر دوں گا۔"

"اس کے بعد بھی مشتاق نے کبھی آپ سے کوئی ایسی بات کہی تھی؟"

"اس کے بعد وہ شاید دو یا تین مرتبہ مجھے ملا تھا"۔۔۔ بوڑھے نے جواب دیا۔۔۔ "ایک مرتبہ اُس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے انوری کا رشتہ اُسے دینے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ کہیں ختم تو نہیں کر دیا گیا۔ میں نے اسے جواب دیا تھا کہ بختیار نہ آن ٹپکتا تو انوری اُس کے گھر پہنچ چکی ہوتی۔ میں نے مشتاق کو یقین دلایا تھا کہ میں انوری کا رشتہ اُسے ہی دینے کا فیصلہ کیے بیٹھا ہوں لیکن انوری کی ماں بختیار کے حق میں ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"سات آٹھ روز گزرے۔"

"بختیار کے ساتھ یہ واردات پرسوں رات ہوئی ہے"۔۔۔ میں نے بوڑھے سے کہا اور پوچھا۔۔۔ "کل کس وقت مشتاق آپ سے ملا تھا؟"

"کل دس گیارہ بجے کے درمیان مشتاق میری دکان پر آیا تھا"۔۔۔ بوڑھے نے جواب دیا۔۔۔ "اُس نے خوشی کا اظہار کیا تھا کہ بختیار کو کسی نے پار کر دیا ہے۔"

"کیا آپ نے اُس سے پوچھا تھا کہ یہ کارنامہ کس نے کر دکھایا ہے؟"

"جی ہاں!"۔۔۔ بوڑھے نے جواب دیا۔۔۔ "یہ تو قدرتی بات ہے۔ یہ بات ہوئی تھی۔ مشتاق کہتا تھا کہ اس لوفر لفنگے نے کسی کی بہن یا بیٹی پر ہاتھ ڈالا ہوگا اور اپنے کیے کی سزا پا لی۔"

یہ بوڑھا اتنا مجبور اور مظلوم تھا کہ دماغ پوری طرح اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں اُس سے جو سوال کرتا، وہ سوچے سمجھے اور ہیرا پھیری کیے بغیر مجھے جواب دے دیتا تھا۔ اس سے تو اس کی بیٹی عقل والی تھی جس کے منہ سے مشتاق کا نام نکلا تھا تو وہ چونک پڑی تھی کہ اُس نے ایک راز مجھے دے دیا ہے۔ وہ میرے ذہن میں مشتاق کے خلاف بڑا پختہ شک پیدا کر گئی تھی۔ اب اُس کے باپ نے اس شک کو مزید پختہ کر دیا۔ میرا ذہن مشتاق کے گرد گھومنے لگا۔ میں نے بوڑھے کو باہر بھیج دیا اور اس کی چھوٹی بیٹی راحیلہ کو بلایا۔

بے غیرت ماں کی بیٹیاں

راحیلہ نے اندر آتے ہی برقعے کا نقاب اٹھا دیا۔ وہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ خوبصورت تھی اور اُس کے جسم کی ساخت انوری سے زیادہ پُرکشش تھی۔ اُس کے چہرے پر بھی وہی گھبراہٹ تھی جو ہونی چاہیئے تھی۔ انوری کے ساتھ تو میں نے شفقت اور ہمدردی سے بات کی تھی۔ راحیلہ کو میں نے خوف اور گھبراہٹ میں ہی رکھنا بہتر سمجھا۔

"تمہارے گھر کی ہر ایک بات مجھے پہلے ہی معلوم تھی"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اب تمہاری بڑی بہن دو گھنٹے میرے پاس بیٹھ کر گئی ہے۔ تم یوں کرنا کہ جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرنا۔ مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کرو گی تو یہ سوچ لو کہ یہ تھانہ ہے۔ مجھے سب کچھ سچ بتا دو گی تو میں تمہاری بہت عزّت کروں گا.... کیا تمہاری ماں کو معلوم ہے کہ بختیار کے ساتھ تمہارے تعلقات ناجائز ہیں؟"

اُس نے سر جھکا لیا۔ میں نے اُسے زیادہ سوچنے کی مہلت نہ دی اور اپنا سوال دُہرایا۔ اُس نے آہستہ سے سر ہلا کر بتایا کہ ماں کو معلوم تھا۔

"ماں تمہارا رشتہ بختیار کو دینا چاہتی تھی یا انوری کا؟"

"پہلے تو انوری کی بات ہوئی تھی"۔۔۔ اُس نے دبی دبی اور شرمائی ہوئی سی آواز میں جواب دیا۔۔۔ "لیکن بختیار نے انوری سے توجہ ہٹا لی تھی۔"

مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کس کے تعلقات کس کے ساتھ ہیں اور تعلقات کیسے ہیں۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون غیرت مند یا کون سا رقیب تھا جس نے بختیار کو کلہاڑی سے راستے سے ہٹانے

کی کارروائی کی تھی۔ میں نے راحیلہ سے پوچھا کہ بختیار سے پہلے اس کے پاک یا ناپاک تعلقات کس کے ساتھ تھے؟

"کسی کے ساتھ بھی نہیں تھے"۔۔۔ راحیلہ نے جواب دیا۔

میں نے کسی رقیب کی نشاندہی کرانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ لڑکی اپنے اس جواب پر قائم رہی کہ اُس کے تعلقات کسی کے ساتھ نہیں تھے نہ ہی اُس نے کبھی ایسی بات سوچی تھی۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ کوئی آدمی اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالے اور وہ اپنے بھائیوں کو بتائے تو اُس کے بھائی کیا کریں گے؟ اُس نے جواب دیا کہ وہ اندر جا کر بیٹھ جائیں گے۔

ان دونوں بھائیوں کے متعلق میرا ذہن پہلے سے صاف تھا۔ اُن میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ میں راحیلہ سے کچھ اور پوچھنے لگا تو اُسے اُبکائی آئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا اُسے کوئی اس قسم کی تکلیف ہے؟ وہ آخر کم سن لڑکی تھی۔ اُس نے ایسا جواب دیا کہ میں شک میں پڑ گیا۔ وہ مجھے کوئی بیماری بتانا چاہتی تھی جو اُسے معلوم نہیں تھی۔ اُسے یکے بعد دیگرے تین چار ابکائیاں آئیں۔

"کیا گھبراہٹ محسوس کر رہی ہو؟"۔۔۔ میں نے اُس سے پوچھا۔۔۔ "ابکائیاں کب سے آ رہی ہیں؟"

"جب کبھی ایسی ویسی بات ہو جاتی ہے تو مجھے اُبکائیاں آنے لگتی ہیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "کسی گھر میں ماتم ہو جائے تو میں وہاں نہیں جاتی۔ اگر جاؤں تو میّت کو نہیں دیکھتی۔ اگر میّت کا چہرہ دیکھ لوں تو صرف اُبکائیاں نہیں بلکہ مجھے قے آنے لگتی ہے۔"

مجھے دراصل کچھ اور شک ہو گیا تھا لیکن بات کچھ اور نکلی۔ بہرحال راحیلہ کی صحت کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اُس سے مشتاق کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ اچھا آدمی ہے لیکن طبیعت کا بڑا سخت ہے۔

اسے باہر بھیج کر میں نے اُس کی ماں کو بُلایا۔ اُس نے آتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ میں خاموشی سے اس طرح سنتا رہا جیسے میں اُس سے ڈر گیا ہوں۔ میں نے اُسے بولنے دیا۔ وہ ہر کسی کو کوس رہی تھی لیکن بختیار کا نام لیتی تو "بے چارہ بختیار" کہتی تھی۔ چونکہ میں خاموش تھا اس لیے وہ بولتی ہی چلی گئی۔ جب اُس نے کہا کہ میری شریف بیٹیوں کو بدنام کر دیا گیا ہے تو میں ضبط نہ کر سکا۔

"تم جیسی بے غیرت ماؤں کی بیٹیوں کی قسمت میں سوائے بدنامی کے اور کچھ بھی نہیں لکھا ہوتا"۔۔۔ میں نے آگے جھک کر کہا۔۔۔ "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمہارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے اس بیچارے بختیار کو کس نے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا تم اس معاملے میں مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟"

"میں کیا بتا سکتی ہوں؟"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "میں پردہ دار عورت ہوں۔"

"تمہارا کوئی پردہ نہیں رہا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "مجھے صاف صاف بتا دو کہ تم نے بختیار کے ہوتے ہوئے اپنی کسی بیٹی کا سودا کسی اور کے ساتھ کر لیا تھا؟"

اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے اپنا سوال دُہرایا اور کہا کہ اب میں اُسے بحث کی اور زیادہ بولنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اُس نے اُکھڑے اُکھڑے سے لہجے میں اُوٹ پٹانگ سا جواب دیا۔

"کیا تم نے مشتاق کو انوری کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا؟"

"نہیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"کیا مشتاق نے یا اُس کی ماں یا اُس کے باپ نے تمہیں کبھی کہا تھا کہ منگنی یا شادی کر دو؟"

"انہوں نے تو کئی بار کہا تھا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "لیکن میں ابھی سوچ میں پڑی ہوئی تھی۔"

"تم کیا سوچ رہی تھیں؟" — میں نے کہا — "یہی سوچ رہی ہو گی نا کہ مشتاق کو صاف جواب دے دوں کیونکہ تم نے بختیار کو پھانس لیا تھا۔"

"ہاں" — اُس نے جواب دیا — "میں مشتاق کو صاف جواب دے دینا چاہتی تھی۔"

"کیوں؟" — میں نے پوچھا — "اُس میں کیا خرابی تھی؟"

"وہ اچھا آدمی نہیں" — اُس نے جواب دیا — "لڑائی جھگڑے بہت کرتا ہے اور غصیلا بھی ہے۔"

اس عورت نے مشتاق کے خلاف بہت سی باتیں کیں جن میں مبالغہ بھی نظر آرہا تھا۔ میری نظر دو پہلو دیکھ رہی تھی۔ ایک یہ کہ مشتاق واقعی لڑائی جھگڑے کرنے والا اور غصیلا آدمی ہے اور دوسرا پہلو یہ کہ یہ عورت بختیار کو اچھا ثابت کرنے کے لیے مشتاق کے خلاف زہر اُگل رہی ہے۔ میں نے اُس سے مشتاق کے متعلق کئی اور باتیں پوچھیں۔ یہ عورت اُس کے خلاف ہی بولتی رہی۔ اس سے مجھے اور کچھ بھی حاصل نہ ہُوا۔ میں نے ان سب کو جانے کی اجازت دے دی۔

تمہارے ساتھ عورت کون تھی؟

جو آدمی پہلے روز گھوڑے پر سوار رپورٹ لے کر آیا تھا، پتہ چلا کہ وہ صبح سے تھانے میں بیٹھا ہے۔ مجھے اُس سے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اُسے یہ کہہ کر گھر جانے کی اجازت دے دی کہ وہ اس کیس میں گواہ ہے اس لیے وہ گاؤں سے لمبے عرصے کے لیے غیر حاضر نہ ہو۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو مشتاق کا پتہ دے کر کہا کہ اُسے لے آئے۔ میرا اے۔ ایس۔ آئی واپس آگیا تھا۔ وہ جس کام کے لیے گیا تھا میں اُس کی رپورٹ لینے بیٹھ گیا۔ تھانوں میں یوں تو نہیں ہوتا کہ ایک واردات کی رپورٹ آئے تو سارا تھانہ اس کی تفتیش میں لگ جائے۔ اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کے کیسوں کی بھی تفتیش ہو رہی ہوتی ہے۔

کچھ دیر بعد مجھے بتایا گیا کہ مشتاق آگیا ہے۔ میں نے کہا کہ اُسے بٹھاؤ۔ ایک تو میں اے۔ ایس۔ آئی کے ساتھ مصروف تھا اور دوسرے اس لیے بھی میں نے مشتاق کو انتظار میں بٹھا دیا کہ اس قسم کے مشتبہ سے پوچھ گچھ عموماً آدھی رات کے بعد کی جاتی ہے۔ وہ وقت گہری نیند کا ہوتا ہے۔ جب نیند کا غلبہ ہو تو تفتیش کے دوران مشتبہ کے اندر مدافعت کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔ وہ تفتیشی افسر کے سوالوں کے غلط جواب تلاش کرنے میں دقت محسوس کرتا ہے۔ میری نظر میں مشتاق مشتبہ نہیں ملزم تھا۔ میں اے۔ ایس۔ آئی سے فارغ ہو کر گھر چلا گیا۔ نہا دھو کر کھانا کھایا اور سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ مجھے رات بارہ ساڑھے بارہ

بجے جاگنا تھا لیکن میں کسی کو بتانا بھول گیا تھا۔ سب سے پہلے مشتاق کا خیال آیا کہ وہ رات بھر تھانے میں رہا ہوگا۔ اس کا مجھے کوئی افسوس نہ ہُوا۔ کانسٹیبلوں کی بارک میں ایک رات گزار کر اُس کا دماغ نرم پڑ چکا ہوگا۔ میں اطمینان سے تیار ہو کر تھانے گیا تو مشتاق کو اپنا منتظر پایا۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ مشتاق میرے پاس آیا۔ کہنے لگا اُسے کس جرم میں پُوری رات تھانے میں رکھا گیا ہے۔ میں نے دوستانہ انداز سے اُس کا بازو پکڑا اور اُسے برآمدے سے اتار کر کچّی زمین پر لے گیا۔ میں نے کہا کہ ہمارے ساتھ اُسے اتنی سی بھی محبت نہیں کہ ایک رات ہمارا مہمان رہ سکے۔

"اللہ آپ کی میزبانی سے بچائے" — مشتاق نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

میں نے نیچے دیکھا۔ اُس نے شوز پہن رکھے تھے۔ میں نے زمین پر اُس کے پاؤں کا نشان دیکھا تو مجھے بڑا خوشگوار سا دھچکا لگا۔ یہ وہی مردانہ کھُرا تھا جو ایک عورت کے کھُرے کے ساتھ موقعۂ واردات پر دیکھا تھا۔ ایک پاؤں کا تلا مرمّت کیا ہُوا تھا۔ میں نے پہلے ہی کھوجی کو بلوانے کے لیے کانسٹیبل بھیج دیا تھا۔ اُس کے کھُرے کا مولڈ تھانے میں موجود تھا۔ میں مشتاق کو اپنے دفتر میں لے گیا۔

"مشتاق بھائی!" — میں نے اُسے کہا — "لمبی چوڑی باتوں کو چھوڑو۔ میں نے بختیار کے متعلق جو کچھ سنا ہے، اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کرتا جو تم نے کیا ہے.... مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہارے ساتھ موقعۂ واردات پر جو عورت تھی وہ کون تھی؟"

"جو میں نے کیا ہے؟" مشتاق نے حیرت زدہ ہو کر کہا — "مجھے اُس کے ساتھ تو ابھی بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ نہ میں موقعۂ واردات پر تھا، نہ کوئی عورت میرے ساتھ تھی اور نہ میں اس قماش کا آدمی ہوں۔"

"مجھے چکّر دینے کی کوشش نہ کرو مشتاق!" — میں نے کہا — "میں مکمل شہادت اکٹھی کرنے کے بعد تمہارے ساتھ بات کر رہا ہوں۔ اپنی زبان سے بتا دو کہ تم نے اُسے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" — اُس نے پوچھا اور کہا — "میں نے اُس پر حملہ نہیں کیا۔ میں یہ آپ کو بتا دوں کہ میں اُسے بخشنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر اس پر یہ حملہ نہ ہوتا تو میں اُسے اگر جان سے نہ مارتا تو اُس کی ایک ٹانگ یا بازو ضرور توڑ دیتا۔"

"میری بات غور سے سنو مشتاق!...."

"نہیں جناب!" — اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا — "میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ اگر آپ کو میرے خلاف کوئی شہادت ملی ہے تو وہ مجھے نہ بتائیں۔ آپ تجربہ کار تھانیدار ہیں۔ خود اُس پر غور کریں۔ کھوٹا کھرا الگ ہو جانے تک مجھے حوالات میں بند کر دیں۔ میں اپنی صفائی میں صرف یہ کہوں گا کہ میں نے بختیار پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں آپ کو یہ پھر بتا دیتا ہوں کہ میرے دل میں بختیار کی نفرت بھری ہوئی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ وہ مرے گا نہیں۔ اگر ٹھیک ہو کر وہ انوری اور راحیلہ کے گھر گیا تو میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔"

"کیوں؟" — میں نے پوچھا — "اتنی زیادہ نفرت کی وجہ کیا ہے؟"

"اگر آپ کو واقعی شہادت مل گئی ہے تو یہ سوال آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟" — مشتاق نے کمالِ دلیری اور خود اعتمادی سے کہا — "اگر آپ میری زبان سے وجہ سننا چاہتے ہیں تو سُن لیں.... اس شخص نے دو پاکباز بہنوں کو خراب کیا ہے۔ ان کی ماں بے شک بدنام عورت تھی لیکن لڑکیاں ایسی نہیں تھیں۔ میں انوری کے ساتھ شادی کر رہا تھا اور انوری خوش تھی لیکن اس شخص نے ایسا چکّر چلایا اور ایسی نوسر بازی کی کہ اس نے انوری کے ساتھ شادی کا وعدہ کر کے اُس کی چھوٹی بہن کو خراب کرنا شروع کر دیا۔"

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ مشتاق کہاں تک سچ بول رہا ہے، میں نے یہ جانتے ہوئے کہ اُس کی اور انوری کی ملاقات ہوئی تھی، اُس سے پوچھا کہ اُسے انوری تو کبھی نہیں ملی ہوگی۔

"ملی تھی"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "اُس نے مجھے بختیار کی وہ حرکتیں بتائی تھیں جو وہ اُس گھر میں کرتا رہا ہے"۔۔۔ مشتاق نے بالکل وہی بات سنائی جو انوری مجھے سنا چکی تھی۔ ایک لفظ کا بھی ہیر پھیر نہیں تھا۔

جس جرأت اور خود اعتمادی سے مشتاق بات کر رہا تھا اس سے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ شخص سچا ہے۔ گنہگار آدمی جھوٹ بولا کرتا ہے لیکن سننے والا ذہین اور تجربہ کار ہو تو وہ جان لیتا ہے کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ مشتاق کا انداز کچھ اور تھا لیکن اُس کا کھُرا مجھے اس کے خلاف سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں نے اُس پر جرح شروع کر دی۔ سوالوں پہ سوال کیے۔ اُس کے جوابوں سے سوال نکالے۔ اُسے بہت بُرے چکّر دیئے لیکن وہ پہلے سے زیادہ دلیری سے جواب دینے لگا۔

"دیکھیں جناب!"۔۔۔ مشتاق نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔۔۔ "مجھے آپ جھوٹا ثابت نہیں کر سکتے۔ اگر مجھ بے گناہ کو آپ سُولی پر کھڑا کرنا چاہیں تو میں آپ کو روک نہیں سکتا۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ بختیار کا ایسا جانی دشمن کون تھا جس نے اُسے اپنی طرف سے تو قتل ہی کر دیا تھا؟"

"اُس کا مجھ سے بڑا دشمن اور کوئی نہیں ہو سکتا"۔۔۔ مشتاق نے کہا ۔۔۔ "لیکن مجھے افسوس ہے کہ کوئی اور میری باری لے گیا ہے۔ اگر میں ہوتا تو وہاں سے یہ یقین کر کے ہٹتا کہ یہ بدبخت مر گیا ہے۔ میں اسے زندہ چھوڑ کر نہ آتا۔"

اس شخص نے مجھے بڑی ہی پیچیدہ سوچ میں ڈال دیا تھا۔ اگر یہ شخص واقعی سچ بول رہا تھا تو میں ابھی اُسی کھڈے میں پڑا تھا جہاں میں تفتیش کی ابتدا میں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس کا کھُرا کھوجی کو دکھا لوں۔ ماہرانہ رائے وہی دے سکتا تھا۔ میں نے باہر جا کے دیکھا۔ کھوجی آیا بیٹھا تھا۔ میں اُسے برآمدے سے نیچے لے گیا اور اُسے زمین پر مشتاق کا کھُرا دکھایا۔

آپ تصوّر میں نہیں لا سکتے کہ یہ کھوجی جواب ختم ہوتے جا رہے ہیں،

کس قدر ماہر ہوتے تھے۔ بیک وقت کئی کھُرے کئی سال تک اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے تھے۔ یہ کھُرا تو صرف دو روز پُرانا تھا۔ کھوجی اس کھُرے کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا کہ اس کا مولڈ لاؤ۔ مولڈ لایا گیا۔ اُس نے غور سے دیکھا اور مجھے بلایا۔

"نہیں ملک صاحب!"۔۔۔ اُس نے وثوق سے کہا ۔۔۔ "فرق ہے"۔

میں نے بڑے غور سے دیکھا۔ مجھے کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ کھوجی نے کہا کہ جو فرق میری آنکھ نہیں دیکھ سکتی وہ فُٹا (فُٹ رول) دکھا دے گا۔ میں نے فٹ رول منگوا لیا۔ کھوجی نے موقعۂ واردات کے کھُرے میں لگے ہوئے پیوند کا ایک کنارہ ناپا۔ پھر اُسے مشتاق کے کھُرے کے پیوند پر رکھا۔ تقریباً نصف سُوتر کا فرق تھا۔ میں نے مشتاق کو باہر بلا لیا۔ میرے کہنے پر مشتاق نے ایک پاؤں کا جُوتا اتارا۔ کھوجی نے اُس کے جُوتے کا تلا دیکھا اور اُس نے سر ہلا دیا کہ نہیں۔ میں نے فوراً تسلیم کر لیا۔ گو اس قسم کا خطرہ بھی میرے ذہن میں تھا کہ مشتاق نے کہیں اس کھوجی کی مُٹھی تو گرم نہیں کر دی۔ ایسا کم ہی ہُوا کرتا تھا کہ کھوجی کسی ملزم سے اس طرح رشوت لے کر پولیس کو گمراہ کرتے۔ ان لوگوں کو پیسے تو واجبی سے ہی ملا کرتے تھے لیکن اپنے اس فن کو یہ لوگ مقدّس سمجھا کرتے تھے۔

میں نے مشتاق سے کہا کہ وہ جا سکتا ہے۔

"نہیں ملک صاحب!"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "تفتیش مکمل ہونے تک آپ مجھے یہیں رکھیں.... میں آپ کو چیلنج نہیں کر رہا۔ ہو سکتا ہے میں آپ کو کوئی ایسی بات بتا سکوں جو آپ کو معلوم نہ ہو"

میں نے اُسے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ مجھے شاید اُسے گواہ بنانے کی ضرورت پڑے۔ جب ضرورت پڑی، میں اُسے بلا لوں گا۔ میں اُسے فوراً رخصت کرنا چاہتا تھا کیونکہ میرا ایک بڑا زبردست مُخبر آیا بیٹھا تھا۔ وہ میرے علاقے کا اونچے درجے کا بدمعاش تھا۔ باقاعدہ جرائم پیشہ نہیں تھا لیکن اُس کی زندگی اور اُس کا ذریعۂ معاش مجرمانہ تھا۔ اس کا میل جول شہر کے

بڑے بڑے تاجروں اور ساہوکاروں کے ساتھ تھا۔ کسی کی رقم کہیں پھنس جائے تو یہ شخص نکال لاتا تھا۔ سب اُس سے ڈرتے تھے۔ پولیس کا وہ ماہر اور قیمتی مُخبر تھا۔ اس طرح اُس نے پولیس کا تحفّظ حاصل کر لیا تھا۔ کئی پیچیدہ وارداتوں میں اس شخص نے میری بہت مدد کی تھی۔

میں نے اُسے اشارہ کیا کہ میرے دفتر میں آجائے۔

رَجّی بیوہ ہوگئی تو....

وہ جب میرے دفتر میں آیا تو اُس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔

"ملک صاحب! آپ بھی کیا یاد رکھیں گے"۔۔۔ اُس نے دوستانہ بے تکلفی سے اپنا ہاتھ آگے کیا اور میں نے اُس سے ہاتھ ملایا۔ اُس نے اس عورت کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔۔۔ "اسے جانتے ہیں آپ؟"

"نہیں جانتا تو اب جان لوں گا"۔۔۔ میں نے اُس عورت کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر کہا۔۔۔ "میں اسے پہلی دفعہ ہی دیکھ رہا ہوں۔"

"میں نے اسے کہا تھا کہ یہ واردات ہوگئی ہے۔ کوئی خبر لاؤ، ملک صاحب پریشان ہیں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "یہ بڑی قیمتی چیز ہے ملک صاحب! آپ اس کی کاریگری دیکھیں گے تو اس کی باقاعدہ تنخواہ مقرر کر دیں گے۔"

"کیوں نہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "میں زیادہ سے زیادہ خدمت کروں گا۔"

"آپ کو میری ضرورت نہیں ہوگی"۔۔۔ بالی (اس مُخبر) نے کہا۔۔۔ "میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اصل بات اس سے سُن لیں"۔۔۔ اور وہ میرے ساتھ ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام تو میرا رضیہ ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "لیکن مجھے رَجّی کہتے ہیں۔"

"کیا خبر لائی ہو؟"۔۔۔ میں نے اُس سے پوچھا اور کہا۔۔۔ "تمہاری بات سننے سے پہلے میں تمہیں پکّا وعدہ دیتا ہوں کہ تمہاری اس خبر سے میرا

کام ہو گیا تو میں تمہیں اپنی پکّی خبر بنالوں گا۔"

"اگر بالی مجھ سے نہ پوچھتا تو میں یہ راز کسی کو نہ دیتی"۔۔۔ رَجّی نے کہا۔

"کیوں؟"۔۔۔ میں نے پوچھا ۔۔۔ "تمہیں زیادہ اجرت ملنے کی توقع تھی؟"

"نہیں"۔۔۔ اس نے کہا ۔۔۔ "پیٹ پالنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ یہ ختم ہونے کا ڈر ہے۔"

"تم پیٹ پالنے کی فکر نہ کرو"۔۔۔ میں نے اُسے تسلّی دی اور کہا۔ "تمہاری سفارش بالی نے کی ہے۔ سمجھو کہ تمہارے لیے روزی کا باعزّت ذریعہ بن گیا ہے.... اب بات کرو۔ میں تمہارا یہ نقصان پورا کردوں گا۔"

"بختیار اُس رات ایک بڑی خوبصورت اور جوان عورت سے ملنے وہاں گیا تھا"۔۔۔ رَجّی نے کہا ۔۔۔ "اُس کا نام وحیدہ ہے اور وہ شادی شدہ ہے۔"

"تم کس طرح یقین سے کہہ سکتی ہو؟"

"اس ملاقات کا انتظام میں نے ہی کیا تھا"۔۔۔ رَجّی نے کہا۔

اس عورت نے بڑی لمبی بات سنائی۔ میں آپ کو آپ کی دلچسپی کی بات سنا دیتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ سُن لیں کہ رَجّی نے یہ پیشہ کیسے اختیار کیا تھا۔ وہ ہندوؤں کی بیٹی تھی۔ نوجوانی میں ایک مسلمان کو دل دے بیٹھی۔ وہ اُسے اس شہر میں لے آیا اور اسے مسلمان کرکے اس کے ساتھ شادی کرلی۔ کچھ عرصہ خاوند نے اسے یہیں رکھا۔ ہندوؤں نے بہت شور شرابا کیا تھا لیکن لڑکی مسلمان ہو کر ایک مسلمان کی بیوی بن چکی تھی۔ دونوں نے پولیس کے انگریز افسروں کو درخواست دے کر پولیس کا تحفّظ حاصل کرلیا تھا۔ خاوند کے ساتھ اس کی زندگی بڑی اچھی گزرتی رہی۔ کچھ عرصے کے لیے خاوند اسے کسی اور شہر میں لے گیا۔ چند سال وہاں رہ کر پھر اس شہر میں آگیا۔ رَجّی اولاد کے معاملے میں بڑی بدقسمت ثابت ہوئی۔ جو بھی بچّہ پیدا ہوتا تھا، چند ماہ زندہ رہ کر مر جاتا تھا۔ شہر میں انہوں نے اپنا مکان بنا لیا تھا۔ جب وہ

میرے پاس آئی، اس سے سات آٹھ سال پہلے اس کا خاوند مر گیا تھا۔ اُس وقت اس کی عمر تیس سال سے خاصی اوپر ہو چکی تھی۔

اس کا کوئی سہارا نہ رہا۔ اپنے ماں باپ کے گھر تو یہ جا ہی نہیں سکتی تھی، اس کے ساتھ زیادتی یہ ہوئی کہ اس کے سسرال نے بھی اسے قبول نہ کیا۔ زندہ رہنے کے لیے رَجّی نے لوگوں کے گھروں میں کام شروع کر دیا۔ بڑے اچھے جسم اور اچھی خاصی شکل وصورت کی عورت تھی۔ بعض افراد نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ یہ اپنا دامن بچاتی رہی لیکن زندہ رہنے کی ضرورت نے اسے بعض روپے پیسے والوں کی عیاشی کا ذریعہ بنا دیا۔ آخر بالی کے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی۔ اس کے بعد اس پر بُری نظر رکھنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔

رَجّی نے ایک کاروبار اور بھی شروع کر دیا۔ میں اپنی کہانیوں میں اس کاروبار کے متعلق کئی بار لکھ چکا ہوں۔ یہ ہے پیغام رسانی یعنی چوری چھپے ملاقاتیں کرانا۔ اس فن میں اس نے مہارت حاصل کرلی۔ چونکہ وہ ہنس مکھ تھی اور باتیں کرنا جانتی تھی، اس لیے اس نے لوگوں کے گھروں میں اپنی عزّت پیدا کرلی۔ اس کے خفیہ کاروبار کا کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ ایسی عورتیں آج بھی شہروں کے گلی محلّوں میں اور دیہات میں پائی جاتی ہیں۔

بختیار نے اسے بہت استعمال کیا۔ وہ عورتوں کا شکاری تھا۔ اس شکار میں وہ رَجّی کو خاصی اُجرت دے کر استعمال کرتا تھا۔ رَجّی نے بختیار کا دوستانہ متعدد عورتوں کے ساتھ کرایا تھا۔ انوری اور راحیلہ کی ماں تک پہلا پیغام رَجّی لے کر گئی تھی۔

"اب وہ ایک اور جوان اور شادی شدہ عورت کے پیچھے پڑا ہُوا تھا"۔۔۔ رَجّی نے کہا ۔۔۔ "یہ ہے وحیدہ۔ یہ لڑکی انوری اور راحیلہ کی سہیلی ہے۔ بختیار نے مجھے بتایا تھا کہ انوری اور راحیلہ کے گھر اس نے وحیدہ کے ساتھ تھوڑی سی بے تکلّفی پیدا کرلی ہے۔ باقی کام تم کردو۔ معلوم کرلینا کہ وحیدہ نقد چاہتی ہے یا تحفے تحائف پر راضی ہو گی۔ میں

نے اپنی زبان کا کمال دکھایا اور وحیدہ کے دل میں اپنی محبّت پیدا کرلی۔ پھر آہستہ آہستہ اس تک بختیار کی باتیں پہنچانا شروع کردیں....

"ایک روز بختیار نے مجھے بتایا کہ وحیدہ کے ساتھ اُس کی ملاقات ہوئی ہے اور اُس نے وحیدہ کو اپنی نیّت کے بڑے صاف اشارے دیئے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ وحیدہ ہنس پڑی تھی۔ اگر بُرا مانتی تو وہ بھی پتہ چل جاتا۔ میں نے وحیدہ کے گھر زیادہ آنا جانا شروع کردیا۔ میں نے صاف طور پر دیکھا کہ وحیدہ بختیار کا نام سُن کر خوش ہوتی تھی۔ ایک روز بختیار نے مجھے کہا کہ وحیدہ اگر مان جائے تو کسی رات جہاں وہ چاہے مجھے بلالے.... بختیار نے کانوں کی بالیوں کا ایک جوڑا جو خالص سونے کا تھا، مجھے دیا کہ وحیدہ تک پہنچادو۔ وحیدہ نے یہ تحفہ قبول کرلیا اور مجھے اگلے روز آنے کو کہا...

"میں دوسرے دن گئی تو وحیدہ نے مجھے کہا کہ خانقاہ کے ساتھ والے کھڈوں کے علاقے میں وہ آج رات دس بجے کے لگ بھگ پہنچ جائے گی۔ بختیار سے کہنا کہ آجائے۔ وحیدہ نے کہا تھا کہ اُس رات اُس کا خاوند گھر نہیں ہوگا۔ میں نے یہ پیغام بختیار کو دے دیا۔ بختیار نے مجھے پانچ روپے دیئے اور کہنے لگا کہ کل تمہاری جھولی بھردوں گا لیکن اگلے دن پتہ چلا کہ بختیار ہسپتال میں پڑا ہے.... میں یہاں تک ہی جانتی ہوں۔"

اُس نے مجھے وحیدہ کے گھر کا اتا پتہ دیا۔ میں نے رجّی سے کہا کہ آج سے وہ پولیس کی باقاعدہ مُخبر ہے اور میں اس کی تنخواہ مقرر کرا کے اُسے بتادوں گا۔ میں نے اُسے یہ تاکید کرکے بھیج دیا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرے کہ میرے ساتھ اُس کی کیا بات چیت ہوئی ہے۔

کھُرا اِس خوبصورت عورت کا تھا

کوئی ایک گھنٹے بعد وحیدہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کا خاوند بھی اُس کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے کھوجی کو بلایا۔ وہ ابھی تھانے میں ہی بیٹھا تھا۔ ضروری نہیں کہ وحیدہ وہی جوتی پہن کر تھانے آئی ہو جو اُس نے واردات کی رات پہن رکھی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا اور میری خوش نصیبی کہ اُس نے وہی سینڈل پہن رکھے تھے۔ کھوجی نے اُس کی جُوتی کا تلا دیکھتے ہی مجھے سر کے اشارے سے بتایا کہ یہی کھُرا تھا۔ میں نے کھوجی کو باہر بھیج دیا اور وحیدہ کی طرف توجہ دی۔ وحیدہ کے چہرے پر قدرتی طور پر گھبراہٹ تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں جو میں نے انوری اور راحیلہ کے چہروں پر دیکھی تھی۔ وحیدہ بھی ان دونوں بہنوں جیسی خوبصورت تھی۔ عورت کی خوبصورتی بڑے بڑے خوفناک فتنے جگاتی ہے۔ اس خوبصورتی نے بادشاہوں کے تختے اُلٹے ہیں۔ بختیار کا وحیدہ کی خاطر اِس طرح زخمی ہوجانا میرے لیے حیران کُن نہیں تھا۔ کالے برقعے میں اپنے سامنے بیٹھی ہوئی وحیدہ کو دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ ایک طرف شیطانی جذبات تھے دوسری طرف سونے کے تحفوں کی ہوس تھی اور یہ لوگ نتائج سے ناواقف تھے۔

"وحیدہ!"— میں نے اُس سے کہا— "مجھے دو سوالوں کے جواب دے دو۔ پہلا یہ کہ تمہیں بختیار کے ساتھ کس نے دیکھ لیا تھا؟ دوسرا یہ کہ جس آدمی نے بختیار پر قاتلانہ حملہ کیا تھا، کیا تم اُس کے ساتھ چلی گئی تھیں؟ ایک تیسرا سوال بھی ہے۔ تمہارا خاوند کہاں تھا؟"

وحیدہ کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ اُس نے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹے۔ اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں اُلجھا کر چٹخایا۔ بے چینی کو دبانے کے لیے کچھ اور حرکتیں کیں۔

"تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکو گی وحیدہ!"— میں نے اُسے نرم سے لہجے میں کہا — "تمہارے اِرد گرد، اوپر اور نیچے ایسی شہادت اور ثبوت کا جال بُنا ہوا ہے جس میں سے تم نکل نہیں سکو گی۔ تم کس کس کی شہادت کو جھٹلاؤ گی؟ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں بشرطیکہ تم میری مدد کرو۔"

"میں نے کوئی جُرم نہیں کیا"— یہ الفاظ اُس کے مُنہ سے بڑی مشکل سے نکلے۔

"میں نے تمہیں کب کہا ہے کہ تم نے جُرم کیا ہے؟"— میں نے کہا — "میں کہہ رہا ہوں کہ بختیار پر قاتلانہ حملہ کرنے والے کو تم جانتی ہو۔ مجھے اُس کا نام بتا دو اور نکلو یہاں سے۔"

"میں اُسے نہیں جانتی"— اُس نے کہا۔

"کیا وہ تمہارا خاوند نہیں تھا؟"— میں نے پوچھا۔

"نہیں"— اُس نے کہا۔ ذرا سی دیر چُپ رہی پھر بولی— "خاوند میرے ساتھ تھا۔"

"فضول باتیں نہ کرو وحیدہ!"— میں نے کہا — "تم تھانے میں ایک تھانیدار کے سامنے بیٹھی ہو۔ تم خاوند کے ساتھ واپس آئی تھیں۔ میں یہ تو نہیں مان سکتا کہ تم بختیار کے ساتھ چوری چھپے ملاقات کے لیے گئیں اور اپنے خاوند کو بھی ساتھ لے گئی تھیں۔"

اتنے میں کھوجی دروازے میں آن کھڑا ہُوا اور اُس نے مجھے سر کے اشارے سے باہر بُلایا۔ برآمدے سے باہر لے جا کر اُس نے مجھے زمین پر کھُرا دکھایا۔ کہنے لگا کہ یہ ہے اصل کھُرا۔ مشتاق جا چکا تھا۔ اُس

کا کھُرا کچھ پرے تھا۔ کھوجی مجھے ایک نیا کھُرا دکھا رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وحیدہ کا خاوند ہم سے چند قدم دُور ٹہل رہا تھا۔ کھوجی نے وہاں جا کر دیکھا اور مجھے بلایا۔ میں نے وہاں وہی کھُرے دیکھے۔ یہ وحیدہ کے خاوند کے تھے جو وہاں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ لیا اور کھوجی سے کہا کہ وہ اُس کے کھُرے کا غور سے معائنہ کرے۔

کھوجی نے فیصلہ دے دیا کہ موقعۂ واردات پر اسی کا کھُرا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص اپنی بیوی کے پیچھے گیا تھا۔ اِسے کسی طرح پتہ چل گیا ہوگا کہ اس کی بیوی کسی سے ملنے گئی ہے۔ اُس نے اپنی بیوی کو بختیار کے ساتھ دیکھ لیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس نے بختیار کو کلہاڑی سے کاٹ دیا ہوگا۔

یہ شخص خوبرو اور اچھی حیثیت والا لگتا تھا۔ میں نے وہیں برآمدے میں اُسے الگ لے جا کر کہا کہ میں یہ تو نہیں مان سکتا کہ وہ اپنی بیوی کو ایک غیر مرد سے ملوانے کے لیے رات کو باہر لے گیا تھا، وہ مجھے یہ بتا دے کہ وہ اس غیر مرد کو قتل کرنے نہیں گیا تھا تو اور کیا کرنے گیا تھا؟

"مجھے معلوم نہیں کہ میری بیوی نے آپ کو کیا بتایا ہے"— اُس نے کہا — "میں آپ کو صحیح بات بتاتا ہوں کہ میں وہاں اپنی بیوی کے ساتھ گیا تھا۔"

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ تمہاری بیوی نے بختیار سے ملنے کا وقت مقرّر کر رکھا ہے؟"

"اسی لیے تو میں ساتھ گیا تھا"— اُس نے کہا۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ شخص بہت ہی چالاک ہو یا میرا دماغ جواب دے گیا ہو۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ رَحّی مجھے جھوٹی اطلاع دے گئی ہے۔

"حفیظ یار!"— میں نے اُسے کہا — "کیا مجھے بتا سکتے ہو کہ ہم دونوں میں سے کون پاگل ہے؟ یا یہ بتا دو کہ میں شکل و صورت

سے اتنا ہی احمق لگتا ہوں جتنا تم مجھے سمجھ رہے ہو؟"
اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"ہم دونوں کے دماغ صحیح کام کر رہے ہیں"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔"اگر بختیار پر قاتلانہ حملہ نہ ہو جاتا تو میں اور میری بیوی اُس کے ساتھ جو سلوک کرتے وہ آپ سُن کر لطف اُٹھاتے مگر معاملہ اتنا سنگین ہو گیا ہے کہ میں ڈرتا ہوں کہ آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ میری بیوی بڑی سخت اور سچّی عورت ہے۔ وہ آپ کے کمرے میں بیٹھی شاید ڈر رہی ہو گی لیکن وہ ڈرنے والی نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو اپنی بیوی سے پہلے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ وہاں کس طرح گیا تھا۔"

میں نے اپنے لیے بہتر یہ سمجھا کہ پہلے اس کی بیوی کا بیان لے لوں۔ میں نے حفیظ سے کہا کہ وہ انتظار کرے، میں اُس کی پوری بات سُنوں گا۔ میں دفتر میں وحیدہ کے سامنے جا بیٹھا۔

انوری اور راحیلہ کے بعد وحیدہ

وحیدہ نے آخر بیان دے دیا لیکن میری نظر میں یہ بیان مشکوک تھا۔ وحیدہ کا بیان بڑا لمبا چوڑا تھا۔ میں اس کے ضروری حصّے سُناتا ہوں۔

اُس نے بتایا کہ وہ انوری اور راحیلہ کی سہیلی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ دونوں بہنیں بڑے اچھے اخلاق کی ہُوا کرتی تھیں۔ اُن کی ماں کو وحیدہ نے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ وہ دوسروں کو اُلّو بنا کر کھانے پینے والی عورت تھی۔ انوری اور راحیلہ بھی وحیدہ کے گھر آیا جایا کرتی تھیں۔ پھر بختیار اِن بہنوں کی پاکیزہ زندگی میں داخل ہُوا۔ اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ وحیدہ نے انوری کو بدلتے دیکھا۔ پھر دیکھا کہ وہ جب بھی انوری سے ملی، انوری نے بختیار کی تعریفوں کے پُل باندھے اور اُس کی محبّت کی باتیں کیں۔ انوری خوش تھی کہ اُس کی شادی بختیار سے ہو رہی ہے۔

اپنی سہیلی کو خوش دیکھ کر وحیدہ بھی خوش ہوئی۔ اُس نے اپنے خاوند کو بتایا کہ اُس کی سہیلی انوری کی شادی بختیار سے ہو رہی ہے تو خاوند نے کہا کہ بختیار قابلِ اعتبار آدمی نہیں۔ اُس نے وحیدہ سے کہا کہ وہ انوری کو بختیار کے ساتھ شادی کرنے سے روکے۔ وحیدہ نے انوری کے ساتھ بات کی تو انوری کو وحیدہ کی یہ بات پسند نہ آئی۔ وہ خاموش ہو گئی۔

پھر وہ دن آیا کہ وحیدہ نے انوری کو روتے دیکھا۔ اب راحیلہ اُسی طرح خوش تھی جس طرح انوری خوش ہُوا کرتی تھی۔ وحیدہ انوری کی رازداں بھی تھی۔ انوری نے اُسے بتایا کہ اُس نے بختیار کے ساتھ پاک محبّت کی تھی لیکن بختیار نے محبّت کو پاک نہ رہنے دیا۔ انوری نے یہ صورتِ حال بھی

قبول کرلی تھی مگر بختیار نے انوری سے اُکتا کر راحیلہ کے ساتھ دل لگالیا۔

وحیدہ کو معلوم تھا کہ بختیار نے راحیلہ کو بھی ہوس کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ وحیدہ بختیار کی بیوی کو بھی جانتی تھی۔ وہ بڑی اچھی لڑکی تھی۔ اب وحیدہ نے دیکھا کہ بختیار ایک معصوم لڑکی کو طلاق دے کر انوری کو دھوکہ دے چکا ہے اور اُس کی بہن کو خراب کر رہا ہے تو اُس کے دل میں بختیار کے خلاف نفرت کا طوفان اُٹھ آیا۔ وحیدہ کے بیان کے مطابق بختیار نے وحیدہ کے دل میں اپنی نفرت اور زیادہ کردی۔ وہ اس طرح کہ اُس نے وحیدہ کو چند مرتبہ انوری اور راحیلہ کے گھر دیکھا تھا۔ اُس نے وحیدہ کے ساتھ بے تکلّف ہونے کی کوشش کی۔ وحیدہ زندہ دل لڑکی تھی۔ اُس نے بختیار کی بے تکلّفی کو بُرا نہ جانا۔ وہ بختیار کی نیّت کو نہ سمجھ سکی۔

بختیار نے اپنی نیّت کا اظہار ایک تحفے کی صورت میں کیا۔ وحیدہ نے تحفہ قبول کرلیا اور اپنے خاوند کو جا دکھایا۔ اُس کا خاوند (حفیظ) بڑا سخت اور دلیر تھا۔ وحیدہ اور حفیظ میاں بیوی تھے لیکن ان میں دوستانہ بے تکلّفی تھی۔ حفیظ نے کہا کہ وہ بختیار کو بازار میں پھینٹی لگائے گا۔ وحیدہ نے ہنس کر کہا کہ تماشہ دیکھتے چلو کہ یہ شخص کیا کرتا ہے۔ اگر یہ اور آگے بڑھا تو اسے کسی اور طریقے سے ذلیل کریں گے۔

وحیدہ نے مجھے تفصیل سے سُنایا کہ بختیار کس طرح اور آگے بڑھا لیکن ان کی ملاقات کہیں باہر نہ ہوسکی۔ بختیار نے رَجّی کو استعمال کیا۔ رَجّی نے بختیار کے پیغام وحیدہ تک پہنچانے شروع کردیئے۔ اُس نے آخری تحفہ جو بھیجا وہ کانوں کی بالیاں تھیں۔ ان کے ساتھ بختیار کا یہ پیغام تھا کہ کہیں باہر ملو۔ وحیدہ نے رَجّی سے کہا کہ وہ اگلے روز جواب دے گی۔ وہ دراصل اپنے خاوند کے ساتھ بات کرنا چاہتی تھی۔

اُس نے خاوند کے ساتھ بات کی تو خاوند نے کہا کہ کل رات اُسے خانقاہ والے کھڈوں میں بلالو۔ حفیظ اور وحیدہ نے یہ سکیم بنائی کہ وحیدہ میدان میں کھڑی رہے گی۔ بختیار آئے گا تو وحیدہ اُسے ایک کھڈ میں

لے جائے گی۔ حفیظ قریب ہی چُھپا ہُوا ہوگا۔ وہ نکل آئے گا، پھر دونوں بختیار کو ماریں پیٹیں گے اور اُس کے تمام کپڑے اتار کر جلا ڈالیں گے اور بختیار کو وہاں سے ننگا بھگا دیں گے۔

"پھر یوں ہُوا" — وحیدہ نے بیان دیتے ہوئے کہا — "میں اور حفیظ اُسی جگہ چلے گئے جہاں بختیار کو آنا تھا۔ حفیظ نیچے چلا گیا اور میں اُوپر کھڑی رہی۔ چند منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک آدمی اندھیرے میں سائے کی طرح آتا نظر آیا۔ وہ بختیار ہی ہوسکتا تھا۔ وہ مجھ سے ابھی پندرہ سولہ قدم دُور ہوگا کہ اُس کے پیچھے ایک اور آدمی آیا۔ اندھیرے میں اتنا ہی نظر آتا تھا کہ اُس آدمی نے آگے والے آدمی کے جسے میں بختیار سمجھتی تھی، سَر پر ڈنڈے اور لاٹھی کی ضربیں لگائیں۔ آگے والا آدمی گر پڑا۔ اُدھر سے حفیظ کھڈ سے نکل کر میری طرف آگیا۔ ضربیں لگانے والا آدمی وہاں سے غائب ہو گیا....

"میں نے حفیظ کو بتایا کہ میں نے کیا دیکھا ہے۔ اُس نے کہا کہ آؤ دیکھیں یہ کون ہے جو زمین پر پڑا ہے۔ ہم دونوں اُس آدمی تک چلے گئے۔ وہ خون میں ڈوبا ہُوا تھا۔ حفیظ نے ماچس جلا کر دیکھا۔ وہ بختیار تھا۔ حفیظ نے کہا کہ اس بدبخت نے کسی اور کی بہن یا بیٹی پر ہاتھ ڈالا ہوگا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہُوا۔ اس نے کیے کی سزا پالی ہے۔ ہم دونوں وہاں سے واپس آگئے۔"

کُلھاڑی برآمد ہوئی

وحیدہ کے بیاں میں رَجّی کا جو ذکر تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ میں رجّی کا بیان لے چکا تھا۔ رَجّی نے مجھے بختیار اور وحیدہ کی ملاقاتوں اور آخری ملاقات کے متعلق یہی کچھ بتایا تھا لیکن میں وحیدہ کے سارے بیان کو صحیح نہیں کہہ سکتا تھا۔ وحیدہ کے متعلق میں نے یہ رائے قائم کرلی تھی کہ سیدھی سادی لڑکی نہیں۔ وہ برقعے میں تھی لیکن برقعہ شرافت کا سرٹیفکیٹ نہ تھا۔ لڑکی تیز معلوم ہوتی تھی۔ وہ جب میرے پاس آئی تو اُس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی لیکن اُس نے بیان خوداعتمادی بلکہ بے خوفی سے دیا۔ اس سے مجھے شک ہُوا کہ اس نے اپنے خاوند کے ساتھ مل کر ایک کہانی گھڑلی ہے۔ میں ان دونوں کے جرم کے اس جواز کو صحیح مان سکتا تھا کہ بختیار نے وحیدہ کے ساتھ بڑی گندی دوستی لگانے کی کوشش کی تھی لیکن میں یہ نہیں مان سکتا تھا کہ انہوں نے جرم نہیں کیا۔

میں نے وحیدہ کو برآمدے میں بٹھا کر ایک کانسٹیبل کو اس پر کھڑا کردیا اور اس کے خاوند کو اندر بلایا۔

"اب کہو کیا کہنا چاہتے ہو" ——— میں نے حفیظ سے کہا ——— "یہ خیال رکھنا حفیظ! میں تمہاری بیوی کا بیان لے چکا ہوں۔ میں نے جرح کرکے اُس سے کچھ ایسی باتیں بھی کہلوالی ہیں جو تمہارے خلاف قابلِ یقین ثبوت مہیّا کرتی ہیں۔ تم بڑے عقلمند اور چالاک آدمی ہو سکتے ہو لیکن تم خود محسوس کروگے کہ تھانے میں ایک تھانیدار کے سامنے بیٹھ کر تمہاری عقل اور چالاکی ختم ہوگئی ہے۔ بہتر ہوگا کہ صحیح بات بتادو۔ یہ تمہارے لیے بہتر

ہوگا۔"

"وحیدہ عورت ہے" ——— اُس نے کہا ——— "آپ نے اُسے ڈرا دھمکا کر معلوم نہیں کیا کہلوا لیا ہے۔ میں آپ کو جو باتیں بتاؤں گا وہ غلط نہیں ہوں گی۔"

"بتاؤ" ——— میں نے کہا ——— "میں پوری توجّہ سے سنوں گا۔"

اُس نے بالکل وہی بیان دیا جو وحیدہ نے دیا تھا۔ میں نے اپنے تجربے کے مطابق اُس کے بیان میں سے کئی سوال نکالے، بہت جرح کی، اُسے اُس کے بیان سے بھٹکانے کے لیے بھی زبان کا جادو چلایا لیکن وہ اپنے بیان پر قائم رہا۔ میں نے اس شخص میں بھی بے خوفی اور خوداعتمادی دیکھی لیکن میں اتنی جلدی ان دونوں کو بے گناہ قرار دینے کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ حفیظ نے اپنی بیوی کو بتائے بغیر کسی آدمی سے کہہ دیا ہوگا کہ فلاں وقت اور فلاں جگہ بختیار جا رہا ہوگا، اُسے قتل کرنا ہے۔ وحیدہ کو اپنے خاوند کے اس انتظام کا علم ہی نہیں ہوگا۔ میرے لیے ان دونوں کی کہانی صرف اس قابل تھی کہ میں داد دیتا کہ اُنہوں نے اچھا بیان گھڑا ہے۔

ان کے گھر کی تلاشی ضروری تھی۔ رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ کا وقت ہوگیا تھا۔ میں نے اپنا ضروری عملہ ساتھ لیا اور تلاشی کے لیے چل پڑا۔ حفیظ نے راستے میں میری بہت منّت سماجت کی کہ میں اُس کے بیان پر یقین کرلوں اور اُس کے گھر کی تلاشی نہ لُوں کیونکہ اس میں اُس کی بہت بے عزّتی ہوگی۔ میں نے اُس سے کہا کہ وہ مجرم ہے یا نہیں اور اُس کا بیان قابلِ یقین ہے یا نہیں، مجھے اپنا دستور پورا کرنا ہے۔ اگر وہ میاں بیوی سچے ثابت ہوئے تو میں اُس کے محلّے میں اس پروپیگنڈے کا انتظام کردوں گا کہ یہ دونوں بڑے شریف لوگ ہیں اور کسی دشمن کی غلط مُخبری پر ان کی تلاشی لی گئی ہے۔ تھانیدار کسی کی عزّت بے عزّتی کا خیال نہیں کیا کرتے۔ جُرم کی تفتیش میں جو سامنے آتا ہے، اُسے تھانے بھی بلایا جاتا ہے

اور اُس کے گھر کی تلاشی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر تھانیدار دوسروں کی عزت بے عزتی کا خیال رکھیں تو جرائم کی وہی بھرمار ہو جاتی ہے جو آج کل آپ پاکستان میں دیکھ رہے ہیں۔

میں نے حفیظ کے محلّے کے دو معزّز افراد کو بلوانے کا انتظام کیا اور حفیظ کے گھر کی تلاشی لی۔ ایک کمرے میں سے ایک کلہاڑی برآمد ہوئی۔ میں نے اس کلہاڑی کا نظری معائنہ کیا۔ اُس کا پھل دُھلا ہُوا نہیں تھا نہ ہی رگڑا ہُوا تھا۔ کچھ ایسا پتہ بھی چلتا تھا کہ یہ انسانی جسم پر استعمال نہیں ہوئی لیکن واردات میں استعمال کیے ہوئے ہتھیار نظر کو دھوکہ دے جاتے ہیں۔ ضروری نہیں ہوتا کہ ہتھیار کو استعمال کے بعد رگڑا اور مانجھا جائے تاکہ خون کا نشان باقی نہ رہے۔ کچھ دیر پانی میں رکھنے سے بھی ہتھیار کا پھل صاف ہو جاتا ہے۔ ہتھیار کیمیکل ایگزامینر کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ ان کا معائنہ لیبارٹری میں فورینسک کیمیکلز کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

میں نے حفیظ کو الگ کر کے ایک بار پھر کہا کہ اُس نے اگر بختیار پر قاتلانہ حملہ کیا یا کرایا ہے تو بتا دے۔ اب بھی میں اُسے بچانے کی گنجائش نکال سکتا ہوں۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ میں بختیار کو جانتا ہوں۔ اُسے جس کسی نے بھی قتل کرنے کی کوشش کی ہے بلاوجہ نہیں کی۔ اگر بختیار قتل ہو جاتا تو مجھے خوشی ہوتی۔ میں نے حفیظ سے کہا کہ میری ہمدردی بختیار کی بجائے اُس کے ساتھ ہو گی لیکن حفیظ نہ مانا۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ اور اُس کی بیوی بیان دے چکے ہیں کہ حفیظ نے اپنی بیوی کو بختیار کو باہر بلانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ یہ بیان وحیدہ کو اس جُرم میں برابر کا شریک کرتا ہے۔ اس کے باوجود حفیظ نے کہا کہ جو سچّی بات تھی، وہ کہہ چکا ہے۔ میں نے تلاشی اور برآمدگی کی کاغذی کارروائی کی۔ اس پر معزّزین کے دستخط لیے اور میں حفیظ اور وحیدہ کو تھانے لے گیا۔ حفیظ کو مردانہ اور وحیدہ کو زنانہ حوالات میں بند کر دیا۔

وہ میں تھا

میری تفتیش کی کامیابی کا انحصار کیمیکل ایگزامینر کی رپورٹ پر تھا۔ بہرحال مجھے خاصا اطمینان ہُوا کہ میں نے کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل کر لی ہے۔

رات کے اڑھائی بج چکے تھے۔ میں گھر جا کر سو گیا۔ صبح دو کام کرنے تھے۔ ایک ان دونوں کا ریمانڈ لینا تھا اور دوسرا یہ کہ کلہاڑی ڈیڑھ سَو میل دُور کیمیکل ایگزامینر کے پاس بھیجنی تھی۔

میں صبح معمول سے ذرا دیر سے جاگا۔ تیار ہو کر تھانے آیا اور محرّر ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ حفیظ اور وحیدہ کا ریمانڈ لینے کا انتظام کرے۔ میں نے تھانے کے احاطے کے پھاٹک کی طرف دیکھا۔ دُبلا پتلا سا ایک آدمی ہاتھ میں کلہاڑی لیے چلا آ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے کوفت ہوئی۔ اُس وقت تک اپنی سروس میں چار ایسے کیس میرے پاس آ چکے تھے۔ خاوند نے اپنی بیوی کو کسی کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ لیا تو اُس نے بیوی کو یا بیوی اور اُس کے آشنا کو قتل کر دیا اور تھانے آ گیا۔ اُس نے آلۂ قتل میرے حوالے کیا اور بتایا کہ وہ یہ جُرم کر آیا ہے اور لاش یا لاشیں فلاں جگہ پڑی ہیں۔

یہ آدمی بھی مجھے اُسی قسم کا خاوند نظر آیا۔ میں برآمدے میں کھڑا اُسے اپنی طرف آتے دیکھتا رہا لیکن اُس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے نہیں تھے اور جب وہ قریب آیا تو میں نے اُس کی کلہاڑی کو دیکھا۔ اُس پر بھی خون نہیں تھا۔

وہ میرے سامنے آن کھڑا ہُوا۔ کلہاڑی بائیں ہاتھ میں لے کر اُس نے دایاں ہاتھ ماتھے پر رکھا اور مجھے سلام کیا اور مجھ سے پوچھا، بڑے تھانیدار آپ ہیں؟ میں نے اُسے بتایا کہ میں ہی ہوں۔ اُس نے

مجھے اندر چلنے کو کہا۔ میں اُسے اپنے دفتر میں لے گیا۔

"بختیار پر حملہ میں نے کیا تھا"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "دوسرے دن یہ سُن کر مجھے افسوس ہُوا کہ وہ زندہ ہے .... آپ مہربانی کریں، حفیظ اور وحیدہ کو چھوڑ دیں۔"

"یوں کسی کے کہنے پر کہ اُسے چھوڑ دو اور مجھے بند کر دو، کسی کو چھوڑا نہیں جا سکتا"۔۔۔ میں نے اُسے دوستانہ لہجے میں کہا۔۔۔ "تم پوری بات کرو۔ اگر تمہارا بیان میرے لیے قابلِ قبول ہُوا تو میں تمہارے سامنے ان دونوں کو پوری عزّت سے تھانے سے رخصت کروں گا۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے"۔۔۔ اُس نے کہا پھر سکون اور اطمینان کی آہ بھر کر اُس نے اپنا بیان یوں دیا:

"مجھے اُمید تھی کہ میں نہیں پکڑا جاؤں گا۔ آپ کے تھانے سے مجھے پتہ چلتا رہا ہے کہ آپ کس طرح کی تفتیش کر رہے ہیں۔ جب آپ نے حفیظ اور وحیدہ کو بلایا تھا اُس کے تھوڑی دیر بعد مجھے پتہ چل گیا تھا۔ پھر میں نے پوری نظر رکھی کہ آپ ان کے خلاف کیا کارروائی کر رہے ہیں۔ صرف میں جانتا ہوں کہ یہ دونوں اس جرم کے مجرم نہیں ہیں۔ مجھے پوری امید تھی کہ آپ انہیں چھوڑ دیں گے۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ آپ نے انہیں رَجّی کے بیان پر پکڑا ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ رَجّی کو اور کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ رَجّی کو یہاں تک ہی علم تھا کہ وحیدہ بختیار کے انتظار میں فلاں رات کو فلاں وقت خانقاہ والے کھڈوں کے پاس موجود ہو گی اور بختیار اُس کے پاس جائے گا۔ اس ملاقات کا انتظام رَجّی نے ہی کیا تھا....

"رَجّی کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وحیدہ وہاں گئی تھی یا نہیں اور رَجّی یہ بھی نہیں جانتی کہ اس ملاقات کو روکنے کے لیے بختیار کے پیچھے پیچھے کون گیا تھا.... وہ میں تھا۔"

"بات آگے کرنے سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ وحیدہ تمہاری کیا لگتی

ہے؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"آپ کو توقع ہو گی کہ میں خون کا کوئی رشتہ بتاؤں گا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔ "میرا وحیدہ کے ساتھ جو رشتہ ہے، اسے آپ رُوح کا رشتہ کہہ لیں یا دل کا۔"

اس کے اس جواب سے مجھے اطمینان ہُوا کہ یہ شخص جو بیان دے رہا ہے، غلط نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے رُوح اور دل کے رشتوں والے اکثر دیکھے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بھائی اپنی سگی بہنوں کے لئے اتنا ایثار نہیں کر سکتے جتنا رُوح اور دل کے رشتوں والے کرتے ہیں۔ آج کل اخلاق اور کردار اس قدر بگڑ گئے ہیں کہ مغرب زدہ سوسائٹی میں ہمارے بعض پاکستانی اپنے دوستوں کے ساتھ بظاہر جائز طریقے سے جسے وہ تہذیب کہتے ہیں بیویاں اور بہنوں کا تبادلہ بھی کر لیا کرتے ہیں۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں، اُس وقت منہ بولے بہن بھائی اکثر دیکھنے میں آتے تھے۔ ایسے بھائی اپنی منہ بولی بہنوں کے لیے جانیں قربان کر دیا کرتے تھے۔ میں نے اس شخص کو بھی جس نے اپنا نام صغیر بتایا تھا، وحیدہ کا مُنہ بولا بھائی سمجھا۔ چہرے مُہرے سے یہ آدمی نشئی سا لگتا تھا۔ ایسے آدمیوں سے ہر طرح کے ایثار اور حماقت کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔

"جناب ملک صاحب!"۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا۔۔۔ "میں سب سے پہلے آپ کو وحیدہ کے ساتھ اپنا رشتہ بتا دوں۔ وحیدہ میری برادری کی لڑکی ہے۔ وہ جب بارہ تیرہ سال کی تھی تو میرے دل کو اچھی لگنے لگی۔ جوں جوں دن گزرتے گئے، وحیدہ کا اچھا لگنا ایک ایسی محبّت بن گیا جس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں حیلے بہانے کر کے ہر روز وحیدہ کو دیکھ لیا کروں۔ میرے دل میں وحیدہ کے لیے ہمدردی بھی تھی۔ ہمدردی اس لیے تھی کہ یہ سات آٹھ سال کی تھی جب معمولی سے تنازعہ پر اس کے رشتہ داروں نے اس کے باپ کو دن دیہاڑے گلی میں قتل کر دیا۔ اُن میں سے ایک آدمی کو پھانسی کی سزا ہوئی اور دوسرے کو دس سال سزائے قید۔ یہ جائیداد کا تنازعہ تھا جو بعد میں عدالت

نے پوری کی پوری وحیدہ کی ماں کی ملکیت تسلیم کر لی تھی۔ اگر یہ جائیداد وحیدہ کی ماں کو نہ ملتی تو یہ ماں بیٹی بھیک مانگتی پھرتیں۔ ان کے لیے اللہ کا اور اس کے بعد اس جائیداد کا سہارا تھا جواب بھی ہے....

"وحیدہ کا کوئی بھائی نہیں۔ جس طرح وحیدہ خوبصورت ہے، اسی طرح اُس کی ماں بھی خوبصورت تھی۔ لوگوں کو آپ جانتے ہیں کہ بے آسرا بیوہ کو وہ بڑی کمزور چیز سمجھتے ہیں اور اُسے سو سو لالچ دیتے ہیں۔ وحیدہ کی ماں کے قریبی رشتہ دار کوئی نہیں تھے۔ دُور کے رشتہ داروں نے اُس کی پروانہ کی۔ اس عورت کی اب دشمنی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ عورت دو قسم کے آدمیوں کے گھیرے میں آ گئی۔ ایک جو اسے عارضی یا مستقل بیوی بنانا چاہتے تھے، دوسرے اس کے دشمن۔ ابتدا میں اسے تنگ اور پریشان کیا گیا۔ اُس وقت اس عورت کی عمر تیس سال سے کچھ اُوپر ہو چکی تھی۔ سب کہتے تھے کہ اب یہ عورت گمراہی کی زندگی گزارے گی یا اس کی زندگی تلخیوں میں گزرے گی....

"جناب ملک صاحب! میں اب بھی چاہتا ہوں کہ اس عورت کے پاؤں پر سجدہ کروں۔ اس نے اپنی آبرو کو اپنا ایمان بنا لیا اور مرد بن کر مردوں کے سامنے آ گئی۔ میں اگر اس عورت کی مردانگی کی کہانیاں سنانے لگوں تو آپ مانیں گے نہیں اور دوسرے آپ مجھے چپ کرا دیں گے اور کہیں گے کہ تم صرف یہ بتاؤ کہ تم نے یہ واردات کس طرح کی ہے۔ مختصر یہ کہ اس عورت نے کسی غیر مرد کا سہارا نہیں لیا۔ گلی میں کھڑے ہو کر اس نے محلّے کے تین چار معزّز آدمی بلا لیے اور جس کسی نے اسے پریشان کیا تھا یا کوئی اُلٹی سیدھی بات کہہ دی تھی، اُسے اُس کے گھر سے یا اُس کی دکان سے گریبان سے پکڑ کر لے آئی اور معزّز لوگوں کے درمیان لا کھڑا کیا....

"کیا آپ مانیں گے کہ اس نے دو ہٹّے کٹّے جوانوں کو گلی میں اُلٹا کر دیا تھا؟ اب تک لوگ اس سے ڈرتے بھی ہیں اور اُس کی عزّت بھی کرتے ہیں۔ اسے محلّے کے بزرگوں نے دوسری شادی کے مشورے دیے

لیکن اس نے اپنے دِل سے اپنے مرے ہوئے خاوند کا نام نکلنے نہ دیا۔ اگر آج وہ زندہ ہوتی تو وہ یہاں تھانے میں بیٹھی ہوتی۔ اگر وحیدہ مجرم ہوتی تو ماں اپنے ہاتھوں اس کا گلا گھونٹ دیتی اور اگر آپ اسے بے گناہ حوالات میں بند کر دیتے تو پھر آپ کی خیر نہیں تھی....

"وحیدہ اس ماں کی بیٹی ہے۔ اس میں بھی ماں نے اپنے جیسے اوصاف اور اپنی جیسی دلیری پیدا کی ہے۔ یہ وحیدہ میرے دل میں اُتر گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ لڑکی جب جوان ہوتی ہے تو جہاں اُس کا رشتہ لینے والے اُس کے گھر کے چکّر لگانے شروع کر دیتے ہیں وہاں بعض مغز پھرے جوان اُس کی دوستی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ پھر جسے رشتہ نہیں ملتا یا جسے لڑکی دوستی سے دھتکار دیتی ہے وہ اُسے بدنام کرنے لگتے ہیں لیکن وحیدہ کے چال چلن کے متعلق کبھی کسی نے کوئی بات نہ کی بلکہ محلے والے وحیدہ کے اخلاق کی قسمیں کھاتے تھے....

"میں لڑکپن میں وحیدہ کے گھر جایا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ہمارے جوان ہونے تک جاری رہا۔ وحیدہ سولہ سترہ سال کی ہوئی تو بھی اُس نے میرے ساتھ بچپن اور لڑکپن والی بے تکلفی رکھی۔ میں نے ایک روز وحیدہ سے اپنی دلی محبت کا اظہار کر دیا۔ وحیدہ نے بُرا نہیں جانا۔ اُس نے کہا کہ اُس کی ماں مجھے پسند کرتی ہے، میں اپنی ماں سے کہوں کہ وہ میری ماں کے پاس آئے۔ میں نے وحیدہ سے کہا کہ میں اُس کا رشتہ ہی حاصل کرنا چاہتا ہوں اور اگر اُس کا رشتہ نہ ملا تو میں اُس کی محبّت کو دل سے نہیں نکالوں گا اور میں قسم کھاتا ہوں کہ ساری عمر شادی نہیں کروں گا....

"وحیدہ نے مجھے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔ اللہ کو ہمارا میل منظور ہُوا تو ہماری شادی ہو جائے گی۔ اگر نہ ہوئی تو اپنی اپنی قسمت ہے۔ تم کہیں شادی کر لینا.... جناب ملک صاحب! وحیدہ نے میری محبت کو قبول کر لیا لیکن اُس کا رشتہ مجھے نہ مِل سکا۔ جب رشتے سے جواب ہُوا تو مجھے ایسے لگا جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اس انکار کے

باوجود میں اُس کے گھر جاتا رہا اور اُس کی ماں مجھے پہلے کی طرح اچھا سمجھتی رہی۔ ایک روز وحیدہ کی ماں نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور بڑے پیار سے مجھے سمجھانے لگی کہ اُس نے رشتے سے انکار کیوں کیا ہے۔ اُس نے انکار کی وجہ یہ بتائی کہ میری ماں بڑی تنگ نظر اور لڑاکا عورت ہے اور میرا باپ اُس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ ہماری حویلی تو خاصی بڑی ہے لیکن ہم چھ بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ وحیدہ کی ماں کہتی تھی کہ وحیدہ اُس کی ایک ہی بیٹی ہے اور اسے وہ ایسی جگہ دے گی جہاں ایک تو اُسے ساس سُسر اچھے ملیں اور دوسرے الگ تھلگ رہنے والا خاوند ملے....

"اُس نے ٹھیک کہا تھا۔ میرے ماں باپ نے گھر کو ہمارے لیے بھی جہنّم بنا رکھا تھا۔ میں اگر وحیدہ کو بیاہ لاتا تو اسی جہنّم کے ایک کونے میں اُسے بٹھا دیتا.... وحیدہ کی ماں نے مجھے کہا کہ میرے گھر آتے رہا کرو۔ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ وحیدہ نے کبھی محبّت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن میری محبّت کی اُس نے بہت قدر کی۔ وہ مانتی تھی کہ میں اُسے رُوح کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں لیکن وہ اپنی ماں کے حکم کو ایمان کا درجہ دیتی تھی...

"پھر ملک صاحب! دو سال گزرے وحیدہ کی شادی حفیظ کے ساتھ ہوگئی۔ سچ پوچھیے تو حفیظ وحیدہ کے ہی قابل تھا۔ ہنس مکھ اور دلیر۔ وہ رہنے والا تو کہیں اور کا ہے، یہاں اُس کا کاروبار اور بڑا اچھا مکان ہے۔ وحیدہ اس قدر پاک اور با اخلاق لڑکی ہے کہ اُس نے مجھے اپنے خاوند کے گھر بلایا۔ میں گیا تو اُس نے مجھے اپنے خاوند سے ملوایا اور اُسے کہا کہ یہ میرا مُنہ بولا بھائی ہے۔ یہ جب چاہے گا میرے گھر آئے گا۔ حفیظ بڑے کھلے دل کا آدمی ہے۔ وہ مجھ سے بغلگیر ہو کر ملا۔ یوں سمجھیے کہ وحیدہ نے مجھے خرید لیا۔ اُس کی محبّت میرے لیے پاگل پن کی صورت اختیار کر گئی....

"میں اُس وقت اپنے آپ کو اس دنیا میں سمجھتا تھا جب میں کبھی کبھار وحیدہ کے گھر جاتا تھا۔ وہاں سے نکل کر مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ میں گھر والوں کے لیے بیکار ہو گیا۔ مجھے

باپ اور بھائیوں نے مارا پیٹا بھی کہ میں بالکل نکمّا ہو گیا ہوں۔ میں نے چرس میں سکون حاصل کر لیا۔ یہاں سے میں چرس کا عادی ہو گیا۔ چرس نے مجھے غلط لوگوں کی منڈلی میں جا بٹھایا۔ بڑی تیزی سے میں بدمعاشوں کی قطار میں شامل ہو گیا اور لوگ مجھے بدمعاش سمجھنے لگے....

"بدمعاشوں کی منڈلی میں میری ملاقات رُجّی سے ہوئی۔ رُجّی کے متعلق پتہ چلا کہ در پردہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ میرا اُس کے ساتھ ویسا ہی دوستانہ ہو گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کی عورتیں کسی کا راز اپنے دل میں نہیں رکھا کرتیں۔ ایک روز اُس نے خود ہی مجھے کہا کہ تم نے کبھی مجھے کوئی کام نہیں بتایا۔ میں چرس کے نشے میں تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میرے سامنے پری کو لا کر کھڑا کر دو تو میں اُس کو بھی لات مار دوں گا۔ اُس نے کہا کہ تم کس پری کے چکّر میں پڑے ہوئے ہو؟ میں نے اُسے وحیدہ کا نام بتا دیا....

"یہاں میں آپ کو ایک اور بات بتا دوں کہ وحیدہ نے مجھے اپنے گھر میں آنے کی کھلی اجازت دے دی تھی لیکن میں دو تین مرتبہ ہی اُس کے گھر گیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے چرس پینی شروع کر دی اور میرا شمار بدمعاشوں میں ہونے لگا تو میں نے وحیدہ کے گھر نہ جانے کی قسم کھالی۔ وہ گھر میرے لیے بڑا پاک ہے جہاں وحیدہ رہتی ہے۔ میں اس گھر کے دروازے کو اپنے ناپاک سائے سے بھی پاک رکھنا چاہتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وحیدہ کے ساتھ میرا اس طرح تعلّق ٹوٹ گیا کہ میں اُس کے گھر نہیں جاتا تھا کبھی دُور سے دیکھ لیتا تھا لیکن اُس کی محبّت ایسی تھی جیسے میں سانس لیتا تھا۔ اگر میں اس محبّت کو دل سے نکال دیتا تو وہ میرا آخری سانس ہوتا....

"تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ رُجّی سے ملاقات ہوئی۔ گپ شپ چلی تو اُس نے کہا کہ اپنی جس پری کی خاطر تم آسمان کی پریوں کو لات مارتے تھے وہ کسی اور کی ہو چکی ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کس کی بات کر رہی ہے؟ اُس نے وحیدہ کا نام لیا۔ میں نے اس قدر زور سے اُس کے منہ پر تھپّڑ

مارا کہ عورت ذات چکرا کر گری۔ وہ کوئی شریف عورت نہیں تھی۔ اُس نے مجھے خوب گالیاں دیں اور کہا کہ وہ مجھے وحیدہ کو ایک غیر مرد کے ساتھ موقع پر دکھائے گی....

"اگر مجھے ذرا سا بھی یقین ہوتا کہ یہ بدمعاش عورت سچ کہہ رہی ہے تو میں اُسی وقت وحیدہ کے گھر چلا جاتا لیکن رَجّی کو میں جانتا تھا۔ دو دلوں کو جوڑنا اور کسی سے پیسے لے کر جُڑے ہوئے دو دلوں کو توڑنا اُس کا کاروبار اور اُس کا کمال تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُسے تھوڑے سے دنوں کی مہلت دوں گا، یا تو وہ میرے پاؤں پر سر رکھ کر معافی مانگے یا مجھے وحیدہ کو کسی غیر مرد کے ساتھ دکھا دے یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جائے....

محبّت ہو تو ایسی ہو

"چار ہی دن گزرے تھے کہ رَجّی ملی اور کہنے لگی کہ آج رات فلاں وقت خانقاہ کے کھنڈروں کے پاس چلے جانا وہاں تمہیں بختیار اور وحیدہ اکٹھے ملیں گے یا وحیدہ کھڑی ملے گی یا بختیار اکیلا کھڑا نظر آئے گا اور وحیدہ وہاں آجائے گی....

"میں عقل سے تو عاری ہو ہی چکا تھا۔ جب میں چرس کے نشے میں ہوتا تھا تو میں سمجھتا تھا کہ مجھ میں عقل ہے۔ میں نے گھر سے کلہاڑی لی اور وحیدہ کی گلی کی نکڑ پر جا چھپا۔ تھوڑی دیر بعد گلی کی بتّی کی روشنی میں میں نے حفیظ کو گھر سے نکلتے دیکھا۔ وہ ایک طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وحیدہ باہر نکلی۔ اُس نے دروازے میں رُک کر دائیں بائیں دیکھا اور وہ بھی چلی گئی۔ میں اُس کے پیچھے چل پڑا۔ گلیوں کے دو تین موڑ مُڑ کر میدان شروع ہو جاتا ہے۔ وحیدہ اس میدان میں نکل گئی اور وہ خانقاہ کی طرف چلی گئی۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے گیا۔ ایک طرف سے ایک اور محلّے کی گلی میدان سے ملتی ہے۔ وہاں بتّی لگی ہوئی ہے۔ میں اس گلی کے قریب سے گزرنے لگا تو ایک آدمی گلی میں سے میدان کی طرف نکلا۔ اُس نے میری طرف نہ دیکھا لیکن میں نے بڑی اچھی طرح پہچان لیا۔ وہ بختیار تھا....

"اب کوئی شک نہ رہا۔ میرا دماغ پھر گیا۔ جب بختیار خاصا آگے چلا گیا جدھر وحیدہ گئی تھی تو میں بھی اُس کے پیچھے چلا گیا۔ اب گہرا اندھیرا تھا۔ مجھے بختیار ایک سائے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دور جا کر مجھے ایک اور سایہ سا کھڑا نظر آیا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ وحیدہ ہے۔ میں اور تیز چل پڑا۔ بختیار اس قدر مستی میں تھا کہ اُسے اپنے گرد و پیش کا کوئی ہوش نہ تھا۔ وہ وحیدہ

سے تھوڑی دُور رہ گیا۔ میں تیزی سے اُس تک پہنچا۔ تب اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا....

"وہ جونہی پیچھے مُڑا، میں نے کلہاڑی کا پہلا وار اُس کے سر پر کیا جو شاید اُس کے ماتھے پر لگا۔ وہ اِدھر اُدھر ہُوا تو میرا دوسرا وار اُس کے کندھے پر پڑا۔ وہ گھوما اور ذرا سا جُھکا۔ میں نے تیسرا وار اُس کی پیٹھ پر کیا۔ مجھے اُمید تھی کہ یہ تین وار اُسے زندہ نہیں رہنے دیں گے....

"میں فیصلہ نہ کر سکا کہ وحیدہ کو بھی یہیں ختم کر دوں یا کیا کروں۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک اور آدمی چلا آرہا ہے۔ میں کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر وہاں سے پیچھے کو چل پڑا۔ آپ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی کہ یہ دو تین دن میں نے کس طرح گزارے۔ کبھی میں ارادہ کرتا کہ وحیدہ کو بھی قتل کر دوں، پھر خیال آتا کہ میں اپنی رُوح کو نہیں مار سکوں گا....

"میرے یار انے بڑے لمبے ہیں۔ مجھے پتہ چلتا رہا کہ تھانے میں کیا کارروائی ہو رہی ہے۔ آخر پتہ چلا کہ حفیظ اور وحیدہ کو تھانے بلا لیا گیا ہے اور پھر یہ بھی مجھے پتہ چل گیا کہ دونوں کے گھر والے مل گئے ہیں۔ پھر آج ہی صبح اٹھتے ہی مجھے کسی نے بتایا کہ رات کو حفیظ اور وحیدہ کے گھر کی پولیس نے تلاشی لی ہے اور دونوں کو حوالات میں بند کر دیا ہے....

"جناب ملک صاحب! وحیدہ گنہگار ہی سہی لیکن یہ جُرم اُس نے نہیں کیا جس میں آپ نے اُسے حوالات میں بند کر دیا ہے۔ آپ کرم کریں اور انہیں چھوڑ دیں۔ میں نے کلہاڑی آپ کو دے دی ہے۔ میرے گھر چلیں اور میں وہ کپڑے آپ کو دے دوں گا جن پر خون کے چند ایک چھینٹے پڑے تھے۔"

اس کے بعد میں نے جو کچھ کیا، یہ پولیس کی کارروائی تھی جو ساری کی ساری بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے حفیظ سے الگ یہ پوچھا کہ واردات کی رات وہ اور وحیدہ اپنے گھر سے کس طرح نکلے تھے۔ حفیظ نے بتایا کہ پہلے وہ نکلا تھا اور وحیدہ کچھ دیر بعد نکلی تھی۔ ہم نے یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا تھا کہ اگر رَحّی کہیں دیکھ رہی ہو تو اُسے کوئی

شک نہ گزرے۔

میں نے وحیدہ سے یہی بات پوچھی تو اُس نے بھی بالکل یہی جواب دیا۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد صغیر کے وہ کپڑے بھی میرے پاس آگئے جن پر خون کے چھینٹے دُھلے ہُوئے تھے لیکن ہلکے ہلکے داغ ابھی باقی تھے۔ میں نے اُسی روز حفیظ کی کلہاڑی کی بجائے صغیر کی کلہاڑی کیمیکل ایگزامینر کے پاس پارسل بنا کر دستی بھیج دی۔

کلہاڑی اور اس کی رپورٹ کو تو دو روز بعد آنا تھا، صغیر کے بیان کے مطابق میں نے شام تک خاصی شہادت اکٹھی کر لی البتہ عینی شہادت کوئی نہیں تھی۔ دراصل عینی شاہد میرے قبضے میں تھا اور وہ تھی وحیدہ لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ وحیدہ کو پیش نہیں کروں گا۔

میں نے رات تقریباً دس بجے حفیظ اور وحیدہ کو حوالات سے نکالا اور اُنہیں اپنے دفتر میں بٹھا دیا جہاں صغیر پہلے ہی بیٹھا ہُوا تھا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ دیکھ لو، تمہارے مذاق نے ایک آدمی کو موت تک پہنچایا ہے اور یہ آدمی جیل جا رہا ہے۔ میں نے اُنہیں ساری بات بتائی۔ بہت دیر باتیں سُننے سنانے کے بعد صغیر کو یقین ہُوا کہ وحیدہ ہمیشہ پاک رہی ہے اور اب بھی پاک ہے اور یہ میاں بیوی بختیار کو سبق سکھانا چاہتے تھے۔ وحیدہ کی جذباتیت کا یہ عالم تھا کہ وہ جوش سے اُٹھی اور اُس نے صغیر کو بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا اور وہ بہت روئی۔

بختیار بیس روز بعد ہسپتال سے نکل آیا۔ میں نے صغیر کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ چھ سات مہینے مقدمہ چلا اور صغیر عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو کر گھر آگیا۔ میں نے حفیظ اور وحیدہ کو اس کیس میں شامل ہی نہ کیا۔ صغیر نے مجسٹریٹ کے پاس زیرِ دفعہ ۱۶۴ اقبالی بیان قلمبند کرایا تھا لیکن میرے درپردہ کہنے پر سیشن کورٹ میں جا کر وہ اس بیان سے منحرف ہو گیا۔ اُسے آخر بری ہی ہونا تھا۔

انوری لاپتہ ہوگئی

یہ کیس ختم ہوگیا۔ ہر تھانیدار کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ ملزموں کو سزا ضرور ملے۔ ملزموں کا سراغ لگا کر انہیں گرفتار کرنا خاصا مشکل اور پیچیدہ کام ہوتا ہے۔ اس کے بعد مقدمہ اس طرح قائم کرنا کہ ملزم سزا سے بچ نہ سکے، سراغرسانی سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اگر ملزم بری ہوجائے تو متعلقہ تھانیدار کو اپنی ناکامی کا افسوس ہوتا ہے، لیکن اس واردات میں ملزم صغیر بری ہوگیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں اس خوشی کا باعث بیان کرچکا ہوں۔

مجھے بہت اطمینان ہُوا کہ میں اس کیس کو جس انجام تک پہنچانا چاہتا تھا، یہ اُسی انجام کو پہنچا مگر اس کیس کا تعلق جن لوگوں کے ساتھ تھا، انہوں نے اسے ختم نہ ہونے دیا۔ مجھے یاد نہیں کہ ایک مہینہ گذرا یا ڈیڑھ یا دو مہینے گذر گئے تھے کہ ایک روز انوری اور راحیلہ کا باپ ان کی ماں کے ساتھ تھانے میں آیا۔ میں نے دیکھا کہ ماں کا چہرہ اُترا ہُوا تھا۔ باپ کی تو کمر میں خم آگیا تھا۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ روتا رہا ہے اب پھر رو پڑے گا۔ اس شخص پر مجھے ترس آرہا تھا مگر اُس کی بیوی کو دیکھ کر مجھے غصّہ آگیا۔

"اب کیا لینے آئی ہو؟" — وہ دونوں میرے دفتر میں بیٹھ گئے تو میں نے اِس عورت سے پوچھا۔

"انوری لاپتہ ہوگئی ہے" — اُس نے روتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیا یہ اچھا نہیں ہُوا؟" — میں نے کہا — "تم نے اپنی لڑکیوں

کو جس پٹڑی پر چڑھایا تھا وہ اُدھر ہی کہیں چلی جاتی ہیں جہاں اس قسم کی لڑکیوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہاں غائب ہوگئی ہیں۔"

باپ کے آنسو بہنے لگے تھے جنہیں وہ سر جھکا کر رومال سے پونچھ رہا تھا۔

"لڑکی بالغ ہے بیگم صاحبہ!" — میں نے کہا — "وہ دو چار سال کی نادان بچّی نہیں تھی۔ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔"

"میں ماں ہوں" — اُس نے آنسو بہاتے ہوئے سسکتی زبان میں کہا — "اگر مجھے پتہ چل جائے کہ اپنی مرضی سے گئی ہے تو مجھے تسلّی ہو جائے گی۔ اُسے آخر دوسرے گھر ہی جانا تھا لیکن مجھے ڈر ہے کہ اُسے اغوا کیا گیا ہے اور ہوسکتا ہے اُسے قتل کر دیا جائے۔"

"ایسا کون ہے جس نے اتنی خوبصورت لڑکی کو اغوا کیا اور قتل کر دیا ہوگا؟" — میں نے پوچھا۔

"بختیار" — اُس نے جواب دیا۔

"بختیار کو ایسی ضرورت کیا آن پڑی ہوگی کہ انوری کو قتل کردے؟"

"انوری کو خاموش کرنے کے لئے" — اُس نے جواب دیا — "اپنا راستہ صاف کرنے کے لئے۔"

"دراصل وجہ ایک اور ہے ملک صاحب!" — انوری کے باپ نے کہا — "بختیار کو شک ہے کہ اُس پر قاتلانہ حملہ انوری نے کرایا ہے.... اب ان لڑکیوں نے اور ان کی اِس ماں نے مجھے ننگا کر ہی دیا ہے تو میں اپنی بیٹیوں کو کسی اور کی بیٹیاں سمجھ کر سیدھی اور سچّی بات کرتا ہوں.... میری بیوی اور بختیار کے فیصلے کے مطابق بختیار کی شادی انوری کے ساتھ ہو رہی تھی مگر بختیار اصل شیطان نکلا۔ اُس نے انوری کو خراب کیا اور میری چھوٹی بیٹی کے ساتھ تعلق قائم کرلیا۔ انوری اُسے بُرا بھلا کہتی رہی۔ انوری نے کبھی بختیار کو دھمکی دی تھی کہ وہ اُسے قتل بھی کرا سکتی ہے اور وہ بختیار کو ایسا مزہ چکھائے گی کہ وہ زندہ رہا تو ساری عمر یاد رکھے گا کہ کسی نے اُس سے انتقام لیا تھا.... آپ نے

دیکھ لیا ہے کہ بختیار سے کیسا انتقام لیا گیا ہے۔"

اس شخص کا بیان سُنانے سے پہلے میں آپ کو بتا دوں کہ یہ راز صرف مجھے معلوم تھا کہ صغیر نے وحیدہ کی محبّت کے جوش میں آکر اُس کی عزّت کی خاطر بختیار پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ کسی کو پتہ چل بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے وحیدہ اور اُس کے خاوند حفیظ کو نہ تو تفتیش کے ریکارڈ پر لیا تھا نہ انہیں عدالت میں پیش کیا تھا۔ بختیار کے لیے یہ ایک معمّہ تھا کہ صغیر کو اُس کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ عدالت میں بھی یہ معمّہ حل نہ ہو سکا۔ صغیر کو عدالت میں اسی کا فائدہ ملا تھا۔

اب انوری کا باپ مجھے بتا رہا تھا کہ بختیار کو شک ہے کہ انوری نے اُس سے انتقام لیا ہے اور صغیر کرائے کا قاتل تھا۔ بختیار زندہ بچ گیا۔ انوری کے باپ کا یہ شک بجا تھا کہ بختیار نے انوری سے انتقام لینے کے لیے اُسے قتل کی نیّت سے اغوا کیا ہے۔

"آپ کو کس طرح پتہ چلا تھا کہ انوری لاپتہ ہو گئی ہے؟"

"وہ کبھی کبھی شام کے بعد وحیدہ کے گھر جایا کرتی تھی"۔۔۔ انوری کی ماں نے جواب دیا۔۔۔ "وہ بڑی گہری سہیلیاں ہیں۔ میں نے اُسے وحیدہ کے ہاں جانے سے کبھی نہیں روکا تھا۔ وحیدہ بھی بے چاری پریشان ہے۔ خاوند سے الگ ہو گئی ہے۔ اپنی ماں کے مکان میں رہتی ہے۔ ماں پہلے ہی مر چکی ہے۔"

"وحیدہ خاوند سے الگ ہو گئی ہے؟"۔۔۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔۔۔ "انہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"دونوں خوددار اور حوصلے والے ہیں"۔۔۔ انوری کی ماں نے جواب دیا۔۔۔ "اصل وجہ تو معلوم نہیں۔"

مجھے اچانک خیال آگیا کہ میں وحیدہ اور حفیظ میں دلچسپی کا اظہار کر رہا ہوں جو مجھے ان میاں بیوی کے سامنے نہیں کرنا چاہیئے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ اپنی بیٹی کی بات کریں۔ میں نے اس حیرت کو چھپا

لیا کہ آپس میں اتنی زیادہ محبت کرنے والے الگ کیوں ہو گئے؟

"انوری کل شام بتا کر گئی کہ وحیدہ کے ہاں جا رہی ہے"۔۔۔ ماں نے کہا۔۔۔ "بہت وقت گزر گیا تو میں نے انوری کے بھائی کو وحیدہ کے گھر بھیجا کہ انوری کو لے آئے۔ لڑکا جواب لے کر آیا کہ انوری وحیدہ کے گھر گئی ہی نہیں۔ میں نے لڑکے سے کہا کہ بختیار سے پتہ کرے۔ لڑکے نے واپس آکر بتایا کہ بختیار نے لڑکے کو گالی گلوچ کی اور اسے کہا کہ آئندہ وہ اُس کے گھر نہ آئے۔"

"کیا بختیار اپنے گھر مل گیا تھا؟"

"وہ اپنے گھر سویا ہُوا تھا"۔۔۔ ماں نے جواب دیا۔

"پھر تم اُس پر کس طرح شک کر سکتی ہو کہ اُس نے تمہاری بیٹی کو اغوا کیا ہے؟"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "وہ اُس وقت اپنے گھر سویا ہُوا تھا۔"

"اُس کے پاس روپیہ پیسہ ہے"۔۔۔ انوری کے باپ نے کہا۔۔۔ "اس کا یارانہ غنڈوں بدمعاشوں کے ساتھ ہے۔ وہ جو کام خود نہیں کر سکتا وہ دوسروں سے کروا سکتا ہے۔"

بیٹی کو ماں نے شیطانی راستے پر ڈالا

میرے دل میں بختیار کی نفرت پہلے ہی بیٹھی ہوئی تھی لیکن میں یہ نہیں مان سکتا تھا کہ اس شخص نے انوری کو اغوا کیا ہے۔ میں نے انوری کے ماں باپ سے کہا کہ بختیار پر شک پختہ نہیں ہوتا۔ باپ تو اپنی بیوی اور بیٹیوں کے ہاتھوں مجبور مجھے آنکھیں پھاڑے دیکھتا تھا اور مختصر سی بات کہہ کر چُپ ہو جاتا تھا، انوری کی ماں کی زبان خوب چلتی تھی۔

"شک صرف اس لیے نہیں کہ انوری نے اُسے دھمکی دی تھی" — ماں نے کہا — "ایک وجہ اور بھی ہے۔ میں نے بھی اُسے دھمکیاں دی تھیں۔ میں اُسے کہتی تھی کہ وہ انوری کے ساتھ شادی کرے۔"

"تم نے دھمکیاں کیا دی تھیں؟"

"یہ کہ میں تمہیں سارے شہر میں ذلیل کروں گی" — ماں نے جواب دیا — "میں نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ میں جمعہ کے روز جامع مسجد میں چلی جاؤں گی اور نمازیوں سے بھری ہوئی مسجد میں کہوں گی کہ اس شخص نے ہمیں یوں ذلیل کیا ہے.... میں نے ایسی اور کئی باتیں کہی تھیں۔"

"اور تم یہ بھول گئی تھیں کہ تمہاری موجودگی میں اور تمہاری شہ پر بختیار تمہاری چھوٹی بیٹی کے کمرے میں گھسا رہتا تھا" — میں نے طنز اور غصّے سے کہا — "وہ راتوں کو تمہاری بیٹی کے کمرے میں آتا تھا اور تم تکیے اور پیسے سمیٹتی رہیں۔"

انوری کے باپ نے سر جھکا لیا۔ پھر وہ کرسی پر بالکل ہی جھک

گیا۔ اُس کے جسم کی جنبش سے صاف پتہ چلتا تھا کہ سسک رہا ہے۔

"تم نے ایک لڑکی کو طلاق دلوائی ہے" — میں نے کہا — "اس آہیں تمہیں اور بختیار کو اس دنیا میں سزا دے رہی ہیں۔ تم اپنی بیٹی کو صرف اس لئے ڈھونڈنا چاہتی ہو کہ آمدنی کا تمہارا ایک ذریعہ تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔"

اچانک باپ نے سر اٹھایا اور وہ پھٹ کر بولا — "اور میں اس لڑکی کو صرف اس لیے ڈھونڈنا چاہتا ہوں کہ آپ اُسے عدالت میں کھڑا کریں اور وہ بیان دے کہ اُسے اِس ماں نے شیطانی راستے پر ڈالا تھا۔"

"یہ کیا بک رہے ہیں آپ!" — ماں نے غصّے سے اپنے خاوند سے کہا — "بات کرنی نہیں آتی تو منہ بند رکھا کرو۔"

"اگر میں اِس شخص کی جگہ ہوتا" — میں نے کہا — "تو اپنی زبان بند کرنے کی بجائے تمہیں قبر میں زندہ بند کر دیتا۔ اپنی بیٹی کو گھر سے بھگانے کی ذمّہ دار تم خود ہو" — میں انوری کے باپ سے مخاطب ہُوا — "کیوں بڑے میاں! آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں اس عورت کے کسی ایک لفظ پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی بیٹی کا سراغ لگاؤں؟"

"ملک حضور!" — اُس نے کہا — "اِس بیٹی کے ساتھ مجھے بہت پیار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس کا سراغ لگایا جائے اور اگر اُسے گھر سے بھگانے میں میری اس بیوی کا ہاتھ ہے یا اس کے پیدا کیے ہوئے حالات سے وہ بھاگی ہے تو اسے بھی سزا دی جائے۔ اس عورت نے مجھے سر اٹھا کر چلنے اور دو چار آدمیوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ہمارے گھر میں اب کوئی عورت بھی نہیں آتی۔"

انوری کی ماں نے اُسے قہر اور غضب کی نظروں سے گھورا۔ میرے دلکارنے پر اُس نے اپنے خاوند سے نظریں ہٹائیں۔ اُس زمانے میں

مجھے بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز گالیاں زبانی یاد تھیں۔ پولیس کی گالیاں مشہور ہیں۔ تھانیدار گالیوں کی زبان میں بات کیا کرتے ہیں لیکن یہ عورت تھی اس لیے میں نے زبان قابو میں رکھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ عورت گھر جا کر اپنے خاوند کو بُرا بھلا کہے گی۔ میں نے اسے کہا کہ اُس نے اپنے خاوند کے ساتھ بدکلامی یا بدسلوکی کی تو میں اُسے تھانے میں بٹھالوں گا۔

پاکستانی معاشرے میں ایسی عورتیں اکثر پائی جاتی ہیں جنہیں کھانے پینے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ ایسی عورتیں غریب گھرانوں میں بھی ہوتی ہیں، امیر گھرانوں میں اور متوسط طبقے میں بھی۔ ایسی عورتیں اپنی بیٹیوں کو بھی اپنے جیسا بنا لیتی ہیں اور جب ان کی بیٹیاں بیاہی جاتی ہیں تو بھی انہیں اپنے اثر سے آزاد نہیں ہونے دیتیں۔ انہیں شہ دیتی رہتی ہیں کہ وہ اپنے خاوندوں سے پیسے بٹور کر اپنی ماؤں کو دیتی رہیں۔ ایسی عورتیں اپنے دامادوں پر قبضہ جمانے کی اور انہیں ان کے ماں باپ سے الگ کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ انوری اور راحیلہ کی ماں ان عورتوں سے دو ہاتھ آگے تھی۔

میں نے اس عورت اور اس کے خاوند کے ساتھ تھوڑی دیر بحث مباحثہ کر کے اور ان سے کچھ اور ضروری باتیں معلوم کر کے انوری کی گمشدگی کی رپورٹ لے لی۔ میرے پوچھنے پر انوری کی ماں نے بختیار پر ہی شک لکھوایا اور کہا کہ صرف وحیدہ ہے جو انوری کی رازدان سہیلی ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ انوری اتنی زیادہ باہر نہیں نکلتی کہ وہ کسی اور آدمی کے ساتھ دوستی لگا سکتی۔

"بختیار کے علاوہ ایک آدمی اور ہے جس پر شک کیا جا سکتا ہے"— انوری کے باپ نے کہا— "وہ ہے حفیظ۔ وحیدہ کا خاوند ... وہ پچھلے دنوں کئی مرتبہ ہمارے گھر آیا ہے اور میں نے انوری کو اُس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا ہے۔"

"نہیں"— انوری کی ماں نے کہا— "وحیدہ چونکہ انوری کی سہیلی ہے اس لئے اُس کے خاوند کے ساتھ بے تکلفی کوئی عجیب اور قابلِ اعتراض بات نہیں۔"

"میں نے انوری کو شام کے بعد ایک بار حفیظ کے گھر سے نکلتے دیکھا ہے"— انوری کے باپ نے کہا— "مجھے معلوم ہے وحیدہ حفیظ سے الگ ہو کر اپنی ماں کے مکان میں جا چکی تھی۔"

مجھے خیال آیا کہ وحیدہ اور حفیظ کی علیحدگی کہیں انوری کی وجہ سے نہ ہو۔ بہرحال یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ ان دونوں کی اپنی ازدواجی زندگی کا مسئلہ تھا۔ چونکہ یہ دونوں مجھے بڑے اچھے لگے تھے اس لیے مجھے ان کی علیحدگی کا افسوس ہو رہا تھا۔

میں نے راحیلہ کا نام لیا کہ اُسے شاید انوری کے کسی اور آدمی کے ساتھ درپردہ تعلق کا علم ہو۔ اُس کی ماں نے کہا کہ وہ پچاس میل دُور اپنی خالہ کے پاس ہے۔ اُس کی ماں نے بتایا کہ خالہ کے پاس اُسے بھیجنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بہت بدنامی ہو گئی ہے۔ ماں کے بتانے کے مطابق اُسے گئے تین مہینے ہو گئے تھے۔

یہ شخص پاپی تھا

میں نے اُسی روز باقاعدہ تفتیش شروع کر دی۔ بسم اللہ بختیار سے کی۔ بختیار کو خدا نے کشش والی شکل وصورت دی تھی۔ اُس میں مردانہ رعب بھی تھا لیکن کلہاڑی کے زخم نے اُس کا چہرہ بُری طرح بگاڑ دیا تھا۔ زخم کا نشان بڑا بھدّا تھا۔ یہ ماتھے سے ہوتا ہُوا ایک آنکھ سے گذرتا گال تک آگیا تھا۔ آنکھ ضائع ہوگئی اور بیٹھ گئی تھی۔ اِس طرف سے اُس کا چہرہ ایسا بگڑا تھا کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ جب زخم ٹھیک ہوجانے کے بعد ہسپتال سے نکلا تھا تو میں نے اُس سے پُورا بیان لیا تھا۔ اُس سے یہ بھی پوچھا تھا کہ اُس نے اپنی بیوی کو طلاق کیوں دی تھی۔ اُس نے جواب دیا تھا کہ وہ خوبصورت نہیں تھی اور اُس کا رنگ گورا نہ تھا۔

مجھے غصّہ تو بہت آیا تھا لیکن میں پی گیا تھا۔ میں اُسے کہنا چاہتا تھا کہ آئینے میں اب اپنی صورت دیکھ لو اور سزا بھگتو تکبّر کی، لیکن میں نے اُسے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس کا چہرہ عبرت ناک ہوگیا تھا۔ مجھے مخبروں نے بتایا تھا کہ بختیار زندہ دل آدمی ہے لیکن اب اُس کے چہرے پر اداسی اور افسوس تھا۔

اس سے اُس کا چہرہ اور زیادہ بے رونق ہوگیا تھا۔ اگر اُس کا چہرہ اس طرح خراب نہ ہوتا تو بھی مجھے اتنا ہی بُرا لگتا۔ یہ شخص پاپی تھا۔

میرا خیال تھا کہ مقدمہ ختم ہوجانے کے بعد میں اس شخص کا چہرہ کبھی نہیں دیکھوں گا مگر وہ ایک بار پھر میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس پر انوری کے اغوا کا شک کیا گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے خلاف شک صحیح ثابت

ہو اور میں اسے سزا دلاؤں۔ آپ اُس کے گناہوں کی داستان پڑھ چکے ہیں۔ آپ کے دل میں بھی اس شخص کے خلاف نفرت ہی ہوگی۔

آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ رجّی کو میں نے باقاعدہ مُخبر بنا لیا تھا۔ میں نے اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہہ دیا تھا کہ وہ رجّی کو انوری کی گمشدگی کے متعلق بتا کر اُسے کہے کہ اندر کی کوئی خبر لائے۔

میں نے بختیار سے بغیر تمہید کے کہا کہ انوری کو اگر اُس نے غائب کیا ہے یا انوری اپنی مرضی سے اُس کے ساتھ چلی گئی ہے تو مجھے صاف بتا دے۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی مرضی سے اُس کے ساتھ گئی ہے تو مجسٹریٹ کے پاس لے جا کر اُس کا بیان قلمبند کرا لے، پھر اُسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

"اُسے غائب کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "اُس کے ساتھ شادی کرنے سے تو مجھے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اُس کی اور اُس کی ماں کی یہی تو خواہش تھی۔"

"کیا انوری اور اُس کی ماں نے تمہیں دھمکیاں دی تھیں؟"

"بہت جی!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "انوری نے تو مجھے قتل کرا دینے کی بھی دھمکی دی تھی۔"

"کیا وہ کسی کو قتل کرا سکتی ہے؟"

"اللہ کا نام لو جی"۔۔۔ بختیار نے کہا۔۔۔ "پردہ دار لڑکی کسی کو کسی سے قتل نہیں کرا سکتی۔"

"کیا تم راحیلہ کے ساتھ شادی کرو گے؟"

"ابھی نہیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "تھوڑا عرصہ اور گذار کر۔"

"تم اب بھی اُن کے گھر جاتے ہو گے؟"

"دو اڑھائی مہینوں سے نہیں گیا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

میں نے اُس کے ساتھ بہت جھک جھک کی۔ ہر پہلو اور ہر زاویے سے اُس پر حملے کئے لیکن وہ مجھے بالکل صاف دکھائی دیا۔

"اگر میں تم سے پوچھوں کہ انوری کہاں گئی ہے تو کیا رائے دو گے؟"

"جناب! سچی بات ہے، میں نے اُسے شادی سے جواب دے دیا تھا" — اُس نے کہا — "اگر اُس نے کسی اور کے ساتھ دوستی لگالی ہو تو اس کا مجھے علم نہیں۔ ٹوہ لگاؤں گا۔ کچھ نہ کچھ پتہ چل ہی جائے گا۔"

"تمہیں کچھ پتہ چلا ہے کہ صغیر کے ساتھ تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"نہ جی!" — اُس نے کہا — "میرا خیال ہے وہ کرائے کا قاتل تھا۔"

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

اُس کے گھر شام کے بعد جاتی رہی

میں اس کیس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔

رات کو رجّی آ گئی۔ اُس نے بتایا کہ انوری اور حفیظ کا خفیہ دوستانہ ہو گیا ہے اور وحیدہ حفیظ سے علیٰحدہ ہو گئی ہے۔ ابھی طلاق نہیں ہوئی۔ رجّی نے کچھ اور باتیں بتائیں جن سے میں نے ضروری سمجھا کہ حفیظ کو ٹھونک بجا لوں۔ اُسے میں نے اگلے دن صبح بلایا۔

"حفیظ بھائی!" — میں نے اُسے کہا — "تم دوسری بار میرے سامنے آتے ہو۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تمہیں کیا کچھ کہا تھا۔ تم یہ بھی نہیں بھولے ہو گے کہ میں نے تمہیں اور تمہاری بیوی کو اُس کیس میں نہیں آنے دیا تھا۔ میں اب بھی تمہاری مدد کر سکتا ہوں شرط یہ ہے کہ مجھے سچ بتا دو۔"

"کیسا سچ؟"

"انوری کہاں ہے؟" — میں نے پوچھا — "میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے معلوم ہے کہ انوری کے ساتھ تمہارے تعلقات اتنے گہرے ہو چکے ہیں کہ انوری تمہارے گھر شام کے بعد بھی آ جاتی ہے۔"

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا" — اُس نے کہا — "وہ میرے گھر آ جاتی ہے لیکن میں اُسے بیوی نہیں بنانا چاہتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ مجھے اچھی لگتی ہے لیکن اُسے گھر سے بھگا لانے کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔"

"وحیدہ تم سے الگ کیوں ہو گئی ہے؟"

"انوری کی وجہ سے" — اُس نے جواب دیا — "اُس نے مجھ پر

الزام لگایا کہ میں انوری میں غلط قسم کی دلچسپی لیتا ہوں۔ میں نے اُسے یقین دلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔ آخر مجھے وہ بات کہنی پڑی جو میں نے اپنے دل میں دبا کر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ وحیدہ! میں جانتا ہوں کہ صغیر کے ساتھ تمہارے درپردہ تعلقات ہیں۔ اس پر وہ ایسی بگڑی کہ میرے گھر سے چلی گئی۔"

"میں نہیں مانوں گا"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "صغیر تمہارے مقابلے میں کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ تمہارا نوکر لگتا ہے۔"

"ملک صاحب!"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "کون کسی کی خاطر اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کرتا ہے؟"

"تمہارے پاس کوئی ثبوت یا شہادت ہے؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "کیا تم نے وحیدہ کو صغیر کے ساتھ کبھی قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا ہے؟"

"دیکھا تو نہیں"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "لیکن میرا شک بڑا پختہ ہے۔ وحیدہ نے خود مجھے بتایا تھا کہ صغیر ہماری شادی سے پہلے اُسے دیوانہ وار چاہتا تھا۔"

"دیکھو حفیظ بھائی!"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "تمہاری اور وحیدہ کی ازدواجی زندگی کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے۔ میں ایک واردات کی تفتیش کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس واردات کا تمہاری اور وحیدہ کی علیحدگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ تم دونوں میں ناچاقی دیکھ کر میں خوش نہیں۔ تم دونوں مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔"

اُس نے اپنی صفائی پیش کرنی شروع کر دی۔ وحیدہ کے خلاف اُس نے کئی باتیں کیں۔ میں اس موضوع پر اور کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن اُس نے کچھ باتیں ایسی کہیں کہ مجھے بولنا پڑا۔ خاصی دیر باتیں کرتے اور سُنتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ حفیظ کے دماغ پر انوری کا قبضہ ہو گیا ہے۔ میں نے وحیدہ

اور انوری کو بڑی اچھی طرح دیکھا تھا۔ دونوں خوبصورت تھیں۔ جسم دونوں کے ایک جیسے تھے لیکن انوری کی ڈیل ڈول اور انداز میں اور اُس کی مسکراہٹ میں ایسی کشش تھی جو میرے خیال کے مطابق پارسا حضرات کی نظروں کو بھی گرفتار کر لیتی ہو گی۔ وحیدہ کی مُسکراہٹ میں شرم و حیا تھی اور اُس کے چہرے پر پاکیزگی صاف نظر آتی تھی۔ اگر ان دونوں کو کھڑا کر کے کسی سے بھی پوچھا جاتا کہ اُسے دونوں میں سے کونسی لڑکی پسند ہے تو وہ انوری پر ہاتھ رکھتا۔

"ملک صاحب!"۔۔۔ حفیظ نے ایک ایسا انکشاف کیا جو میرے کام آسکتا تھا۔ کہنے لگا ۔۔۔ "صغیر میرے گھر آیا تھا۔ اُس نے وحیدہ کے ساتھ اپنے تعلقات کو پاکیزہ ثابت کرنے کے لیے بہت سی باتیں کیں، پھر مجھے کہنے لگا کہ میں وحیدہ کو گھر لے آؤں۔ اس پر مجھے غصہ آگیا۔ معمولی سا آدمی مجھے بچّہ سمجھ کر لکچر دے رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے اُس کی نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ وحیدہ میرے پاس واپس آنا چاہتی تو خود میرے پاس آتی یا مجھے بلاتی۔ اُس نے تمہیں بھیج کر میری بے عزتی کی ہے۔ میں نے کہا کہ وحیدہ سے کہہ دینا کہ آنا چاہتی ہو تو آجاؤ۔ میں نہ خود آؤں گا نہ تمہیں بلاؤں گا۔۔۔۔

"صغیر نے میرا یہ فیصلہ سُن کر کہا ۔۔۔ 'تم نے دیکھ لیا ہے کہ میں نے وحیدہ کی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے اپنی جان پھانسی کے تختے پر رکھ دی تھی۔ اب تم اُسے اجاڑ رہے ہو۔ میں تمہارا رویّہ برداشت نہیں کروں گا۔ تمہارے لیے بہتر یہ ہو گا کہ وحیدہ کو گھر لے آؤ۔' میں نے اُسے کہا کہ میں اُسے نہ لایا تو تم کیا کرو گے؟ اُس نے کہا ۔۔۔ 'بختیار کی طرح باقی عمر پچھتاتے رہو گے اور انوری کو اِس زمین پر کبھی نہیں دیکھو گے'۔۔۔ میں نے اُسے ڈانٹ دبکار کر گھر سے نکال دیا۔"

"حفیظ! میری ایک بات پوری توجّہ سے سُن لو"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "وحیدہ اور انوری کے متعلق تم بے شمار باتیں کر چکے ہو۔ میں

پولیس کا سب انسپکٹر اور تفتیش کا ماہر ہوں۔ میں نے تمہارے منہ سے کچھ ایسی باتیں کہلوالی ہیں جو تمہارے خلاف جاتی ہیں۔ وحیدہ کو اپنے گھر بساؤ، اسے طلاق دو، جو جی چاہے کرو، مجھے اس سے اب کوئی غرض نہیں۔ مجھے اب سچ سچ بتا دو کہ انوری کے متعلق تمہارا کیا پروگرام تھا۔ صرف دوستی لگائے رکھنی تھی یا اُس کے ساتھ شادی کرنی تھی؟ اگر سچ نہیں بولو گے تو تمہارے گھر کی تلاشی لوں گا۔ ہر کسی کو پتہ چل جائے گا کہ تم پر انوری کے اغوا کا شک کیا گیا ہے۔"

اُس نے کچھ دیر پس و پیش کی اور میں اُس کے پیچھے پڑا رہا۔ آخر اُسے دل کی بات بتانی پڑی۔

"میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ انوری کے ساتھ شادی کروں یا نہ کروں"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "دوستی تو اُس کے ساتھ ہو ہی گئی تھی۔ انوری کو توقع تھی کہ میں اُس کے ساتھ شادی کروں گا۔ اُس کی ماں میری بڑی آؤ بھگت کرتی تھی۔ میں اُس کے اشارے سمجھ گیا تھا۔ اُس کی کوشش یہ تھی کہ میں انوری کے ساتھ شادی کروں۔ ان حالات میں مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں انوری کو گھر سے بھگا لاتا اور اپنے گھر میں چھپا لیتا۔ ماں بیٹی کی تو خواہش ہی یہی تھی۔"

حنیظ اور انوری ایک دوسرے کے بازوؤں میں

مجھے اب انوری کی ماں سے پوچھنا تھا کہ حنیظ کا یہ کہنا کہاں تک سچ ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ حنیظ انوری کے ساتھ شادی کرلے لیکن حنیظ مجھے بڑے کام کا اشارہ دے گیا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ صغیر نے اسے دھمکی دی تھی۔ مجھے خیال یہ آیا کہ وحیدہ دلیر اور آزاد خیال لڑکی تھی۔ وہ بختیار کی پٹائی کے لئے حنیظ کے ساتھ رات کو کھڈوں کے علاقے میں چلی گئی تھی۔ پہلی تفتیش کے سلسلے میں میری اُس کے ساتھ بڑی لمبی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ میری رائے یہ تھی کہ یہ لڑکی اپنی عزت کی خاطر مردوں جیسے اقدام اور کارروائی کر سکتی ہے۔ وہ نڈر اور بے خوف تھی۔ ایسے ممکن تھا کہ اُس نے حنیظ سے انتقام لینے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہو کہ صغیر کے ہاتھوں انوری کو اغوا کرا دیا ہو۔ صغیر کی پہلی واردات آپ پڑھ چکے ہیں۔ وہ تو وحیدہ کی محبت میں پاگل ہو چکا تھا۔ اس پاگل پن میں اُس نے انوری کو غائب کر دیا ہوگا۔

صغیر سے پہلے میں نے وحیدہ سے ملنا بہتر سمجھا۔ میں اُسے تھانے بلانا اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ میں رات کو پرائیویٹ کپڑے پہن کر وحیدہ کے گھر چلا گیا۔ اُسے بتایا کہ انوری کی گمشدگی کے متعلق کچھ پوچھنے آیا ہوں۔

"تم اُس کی گہری سہیلی ہو"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "سنا ہے تم اُس کی رازدار بھی ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اُس کا کسی اور آدمی کے ساتھ دوستانہ تھا جس کے ساتھ وہ گھر سے بھاگ گئی ہو؟"

"آپ نے ٹھیک سنا ہے کہ میں انوری کی گہری سہیلی ہوں"۔۔۔ وحیدہ نے کہا ۔۔۔ "لیکن اُس ڈائن نے میرا ہی گھر اجاڑ دیا ہے۔۔۔۔ بختیار کے

بعد میں اُس کا ایک ہی دوستانہ جانتی ہوں۔ اُس نے میرے خاوند کو پھانس لیا ہے۔ میں نے یہاں تک سنا ہے کہ انوری کی ماں نے جس طرح بختیار سے اُس کی بیوی کو طلاق دلائی تھی اسی طرح وہ حفیظ سے مجھے طلاق دلانا چاہتی ہے۔"

"لیکن یہ انقلاب آیا کیسے؟" — میں نے پوچھا — "تم میاں بیوی تو بڑے سُلجھے ہوئے اور ایک دوسرے کو چاہنے والے تھے۔"

"بس جادو چل گیا" — وحیدہ نے آہ بھر کر کہا — "انوری کی ماں عاملوں اور سادھوؤں سے تعویذ دھاگے، ٹوٹنے اور کالا علم کرانے میں بھی مشہور ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُس کا کرایا ہُوا کوئی عمل کام کر گیا ہے۔"

وحیدہ کے آنسو نکل آئے اور بولتی چلی گئی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اُس نے جو قصّہ سنایا ہے وہ یوں ہے کہ انوری کا گھرانہ اتنا بدنام ہو گیا تھا کہ عورتوں نے خود بھی اُن کے گھر جانا چھوڑ دیا تھا اور اپنی بہو بیٹیوں کو بھی منع کر دیا تھا۔ پہلے انوری کبھی کبھار وحیدہ کے گھر آجایا کرتی تھی۔ اکثر وحیدہ اُس کے گھر جاتی تھی۔ اب سارے محلّے نے اُن کے ساتھ بائیکاٹ کر دیا تو انوری نے تنہائی سے تنگ آکر وحیدہ کے گھر زیادہ آنا جانا شروع کر دیا۔ اُس نے حفیظ سے پردہ ہٹا دیا۔

حفیظ زندہ دل اور خوش طبع آدمی تھا۔ انوری وحیدہ سے کہنے لگی کہ تمہارے گھر آکر طبیعت پھول جیسی ہو جاتی ہے۔ وحیدہ نے انوری کو خوش کرنے کے لیے یہ رویّہ اختیار کر لیا کہ انوری آتی تو وحیدہ حفیظ کو بھی ساتھ بٹھا لیتی۔ اس سے انوری اور حفیظ میں بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ وحیدہ نے دیکھا کہ انوری پہلے سے زیادہ آنے لگی اور وہ اُس وقت آتی جب حفیظ گھر ہوتا تھا۔ وحیدہ نے اپنی نیّت کے مطابق کوئی شک نہ کیا۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ حفیظ انوری کو دیکھ کر چمک اٹھتا تھا۔

ایک روز ایک عورت نے وحیدہ کو بتایا کہ اُس نے گذشتہ رات حفیظ کو انوری کے گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔ وحیدہ نے یقین نہ کیا۔ اُسے حفیظ کے

کردار پر بھروسہ تھا۔ اُس نے حفیظ کو بتایا کہ ایک عورت کہتی ہے کہ اُس نے اُسے انوری کے گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔ حفیظ غصّے سے لال پیلا ہو گیا۔ اُس نے وحیدہ سے کہا کہ بتاؤ وہ عورت کون ہے، میں ابھی اُس کے گھر جاتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ یہ لوگ دوسروں کو بدنام کر کے خوش ہوتے ہیں۔

ایک روز وحیدہ ایک ماتم والے گھر میں چلی گئی۔ انوری کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ اتفاق سے انوری اپنے دروازے میں کھڑی تھی۔ وحیدہ رُک گئی۔ اُس نے انوری کو بتایا کہ فلاں گھر میں ماتم ہو گیا ہے اور وہ وہاں جا رہی ہے۔ انوری نے اُسے کہا کہ واپسی پر تھوڑی دیر کے لیے اِدھر بھی آجانا۔ وحیدہ نے کہا کہ جنازہ چلا جائے گا تو وہ واپس آئے گی۔ ہو سکتا ہے بہت دیر ہو جائے۔

وحیدہ ماتم والے گھر گئی تو اچانک اُسے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ وہاں زیادہ دیر رُکنا محال ہو گیا۔ وہ واپس آگئی۔ اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ ڈیوڑھی سے اندر آئی تو سامنے کمرے میں اُسے حفیظ اور انوری اس طرح ایک ہی چارپائی پر بیٹھے ملے کہ دونوں ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے اور اُن کے منہ ملے ہوئے تھے۔ انہیں دروازہ بند کرنے کا ہوش نہ تھا نہ یہ خبر کہ وحیدہ سامنے کھڑی دیکھ رہی ہے۔

وحیدہ کو تو چکّر آگیا۔ دونوں نے بیک وقت اُسے دیکھا۔ انوری تیزی سے اٹھی اور برقعہ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ وحیدہ کی تو زبان بند ہو گئی تھی۔ حفیظ نے غصّے سے وحیدہ سے کہا کہ اپنی اس سہیلی سے کہہ دو کہ یہاں نہ آیا کرے۔ اتنی بے حیا ہے کہ زبردستی میرے گلے پڑ گئی۔

وحیدہ وہیں سے مُڑی اور انوری کے گھر چلی گئی۔ اُس نے انوری سے کہا کہ بدکاری کے لیے تمہیں میرا ہی گھر ملا تھا؟

"تم یہ بات اپنے خاوند سے کہو" — انوری نے کہا۔

"تم زبردستی اُس کے گلے پڑ گئی ہو" — وحیدہ نے غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور اُسے جلی کٹی سنا دیں۔

"اگر میں زبردستی کرتی ہوں تو وہ یہاں کیوں آجاتا ہے؟" — انوری

نے کہا ــــ "اُسے روکو نا!"

وحیدہ اور انوری میں خاصی جھک جھک ہوئی۔ انوری کی ماں ان کے درمیان آ بیٹھی۔ وحیدہ نے اُسے بتایا کہ انوری کو اُس نے اپنے خاوند کے ساتھ کس حالت میں دیکھا ہے۔

ماں کا ردِعمل بالکل سرد تھا۔ اُس نے انوری سے باز پرس نہ کی اور وحیدہ کے غصّے کو نظر انداز کرتے ہوئے اُسے گلے لگا لیا اور کہنے لگی کہ ایسا شک نہ کرو۔ حفیظ تو بڑا نیک آدمی ہے۔

"اگر حفیظ نیک ہے تو تمہاری یہ بیٹی تو نیک نہیں" ــــ وحیدہ نے کہا ــــ "میری آنکھیں وہی دیکھتی ہیں جو اِن کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے۔ اِس سے پوچھو۔ میں جھوٹا الزام تو نہیں لگا رہی۔"

انوری کی ماں بڑی چالاک تھی۔ اُس نے غصّے کا جواب پیار سے دیا۔

وحیدہ جب یہ قصّہ مجھے سنا رہی تھی تو حیران ہو رہی تھی کہ انوری کی ماں اس حال میں بھی اُس کے ساتھ تحمّل اور پیار سے بات کر رہی تھی جب وحیدہ اُس کی بیٹی پر بدکاری کا الزام لگا رہی تھی۔ میں ذرا سا بھی حیران نہیں تھا۔ وحیدہ ابھی اُس پختہ عمر کو نہیں پہنچی تھی جہاں انوری کی ماؤں جیسے استادوں کی مسکراہٹوں اور آنسوؤں کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ انوری کی ماں خوش تھی کہ انوری نے حفیظ کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے ہیں۔

میرے سہاگ کا خیال رکھنا

وحیدہ نے مجھے بتایا کہ گھر آ کر اُس نے حفیظ سے پوچھا کہ یہ کہاں تک سچ ہے کہ وہ انوری کے گھر جاتا ہے اور انوری کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ حفیظ نے پہلے تو وحیدہ کو ہنستے مسکراتے ٹالنے کی کوشش کی۔ پھر دیکھا کہ وحیدہ مرنے مارنے پر تُلی ہوئی ہے تو حفیظ غصّے میں آ گیا۔

"تم نے بہت بک بک کر لی ہے، اب میری سنو" ــــ اُس نے وحیدہ سے کہا ــــ "تم نے محبّت محبّت کی رَٹ لگا رکھی ہے۔ میرے دل میں تمہاری جو محبّت ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ میری محبّت کا ثبوت یہ ہے کہ میں تمہاری بے وفائی کو ہضم کرتا رہا ہوں۔ تم اپنی بے وفائی پر پردہ ڈالنے کے لیے مجھ پر اوچھے الزام تھوپتی جا رہی ہو۔"

"بولو۔ بات کرو" ــــ وحیدہ نے کہا ــــ "میری صرف ایک بے وفائی ثابت کر دو تو تمہارے ہاتھ سے زہر کا پیالہ پی لوں گی۔"

"کیا تم مجھے گنوار سمجھتی ہو؟" ــــ حفیظ نے کہا ــــ "مجھے اندھا اور بہرہ سمجھتی ہو؟ کیا صغیر پاگل ہے جس نے تمہاری خاطر بختیار پر حملہ کیا تھا؟ اُس نے تو بختیار کو قتل کر دیا تھا۔ کون کسی کی خاطر اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کرتا ہے؟ تم اُس سے چوری چھپے ملتی رہی ہو۔"

"تم بکواس کرتے ہو" ــــ وحیدہ نے جل کر کہا ــــ "تم اپنی کرتوت کو چھپانا چاہتے ہو۔ عورت پر تم جیسے گھٹیا مرد یہی وار کیا کرتے ہیں کہ تم بدکار ہو.... کوئی اور جھوٹ گھڑو حفیظ! کوئی اور بکواس سوچو۔"

بات بڑھ گئی۔ حفیظ مجرم تھا اور اپنے جُرم پر پردہ ڈال رہا تھا۔ وحیدہ

نے اُسے اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ وحیدہ خوددار اور غیرت مند تھی۔ وہ بالکل نہ ڈری۔ اُس نے اپنا ٹرنک اور اٹیچی کیس باہر نکال لیے۔

"اب انوری کو لے آؤ"— وحیدہ نے کہا— "تم جیسے بدکاروں کے گھر بدکار بیوی اچھی لگے گی۔"

وہ باہر نکل گئی اور دو آدمی ساتھ لے آئی۔ ٹرنک اور اٹیچی اٹھوائے اور اپنی ماں کے گھر چلی گئی۔ وہ مکان خالی پڑا تھا۔ حفیظ نے اُسے نہ روکا۔ اُس کے دماغ پر انوری سوار تھی۔

وحیدہ نے مجھے بتایا کہ ایک روز صغیر آگیا۔ اُس نے دروازے پر دستک دی۔ وحیدہ نے دروازہ کھولا۔

"وحیدہ!"— صغیر نے دروازے میں ہی کھڑے رہ کر کہا— "میں تمہارے گھر کو اپنے سائے سے بھی بچانا چاہتا ہوں لیکن تمہیں کسی دُکھ تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ ناراض نہ ہونا وحیدہ! میں نے سنا ہے کہ تم حفیظ سے لڑ جھگڑ کر یہاں آگئی ہو.... اور میں نے سنا ہے کہ حفیظ پر انوری اور اُس کی ماں کا جادو چل گیا ہے.... کیا یہ صحیح ہے؟"

وحیدہ جب مجھے یہ کہانی سنا رہی تھی تو اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ دو چار دنوں میں ہی لوگوں نے خصوصاً عورتوں نے اُس کے اور حفیظ کے متعلق عجیب و غریب اور بڑی شرمناک کہانیاں گھڑ لیں۔ کسی نے وحیدہ کو بدکار کہا اور کوئی حفیظ کو بدکار ثابت کر رہا تھا۔ وحیدہ کے گھر کوئی نہ کوئی عورت آجاتی اور حفیظ کو بُرا بھلا کہتی، پھر وحیدہ سے راز لینے کی کوشش کرتی کہ حفیظ اور اُس کے درمیان کیا ناچاقی پیدا ہو گئی ہے۔ پھر وحیدہ کو کوئی نہ کوئی عورت کسی نہ کسی عورت کے متعلق بتا جاتی کہ وہ اس طرح کی باتیں کر رہی ہے۔

وحیدہ پریشان ہو گئی۔ اُس کے ساتھ جو عورتیں ہمدردی جتاتیں وہی اسے بدنام بھی کرتی تھیں۔ چند دنوں میں ہی وہ ان عورتوں سے اُکتا گئی۔ وہ کسی عورت کو اپنے گھر میں آنے سے روک تو نہیں سکتی تھی، اُس نے بے رُخی

کا رویّہ اختیار کر لیا۔ اُس کا اپنا کوئی عزیز رشتہ دار نہ تھا۔ جو تھے وہ جائیداد کے جھگڑے اور مقدمہ بازی میں اُس کی ماں کی زندگی میں ان سے الگ ہو گئے تھے۔ وحیدہ کو اس احساس نے خون کے آنسو رُلایا کہ اُس کا کوئی ہمدرد نہیں۔

ان حالات اور اس ذہنی کیفیت میں صغیر اُس کے دروازے میں جا کھڑا ہُوا۔ اُس نے ایسے انداز سے بات کی جس میں دلی ہمدردی تھی۔ ایک تو صغیر پر وحیدہ کو بھروسہ تھا، دوسرے اُسے ہمدردی کی اور کسی کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ وہ صغیر کو اندر لے گئی۔

"تم نے جو سُنا ہے وہ سچ سُنا ہے"— وحیدہ نے صغیر سے کہا اور اپنے پاس بٹھا کر اُسے وہ ساری باتیں سنا دیں جو حفیظ نے اُسے اور اُس نے حفیظ سے کہی تھیں۔

"کیا اُس نے تم پر یہ الزام لگایا ہے کہ میرے ساتھ تمہارے ناجائز تعلقات ہیں؟"— صغیر نے دبے ہوئے غصّے سے پوچھا۔

"اسی پر تو ہماری لڑائی ہوئی تھی"— وحیدہ نے کہا— "میں جانتی ہوں کہ اُسے میرے کردار پر پورا بھروسہ ہے۔ میں نے اُسے انوری کے ساتھ پکڑ لیا تھا۔ اُس نے مجھ پر یہ جوابی وار کیا ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ بدنام کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ انوری کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے یا وہ مجھے بھی رکھنا چاہتا ہے اور انوری کی دوستی بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔"

"وحیدہ!"— صغیر نے کہا— "میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ تم کیا چاہتی ہو۔"

"اپنے گھر جانا چاہتی ہوں"— وحیدہ نے کہا— "لیکن جب تک انوری موجود ہے حفیظ کی اور میری نہیں بن سکے گی۔"

وحیدہ نے مجھے بتایا کہ صغیر کچھ دیر چُپ رہا پھر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ مجھے دیکھتا رہا پھر بولا— "میں کچھ کروں گا۔ رویا نہ کرو۔"

وہ چل پڑا۔ وحیدہ اس خیال سے گھبرا گئی کہ صغیر نہ جانے کیا کر بیٹھے۔

اُس نے صغیر کو روک لیا اور اُس سے پوچھا کہ وہ کیا کرے گا۔ وحیدہ نے دیکھ لیا تھا کہ صغیر نے بختیار کا کیا حال کیا تھا۔ اُسے خطرہ نظر آنے لگا کہ صغیر حنیظ پر بھی اسی طرح کا وار کرے گا۔

"صغیر!"— وحیدہ نے اُسے کہا — "میرے سہاگ کا خیال رکھنا۔ حنیظ میرا خاوند ہے۔"

صغیر نے وحیدہ کے چہرے پر نظریں جمالیں اور چپ رہا، پھر اُس نے آہ بھری اور چلا گیا۔ وحیدہ کو حنیظ کا غم لگا رہا۔ اس کے دو تین دن بعد انوری لاپتہ ہو گئی۔

آپ کو انوری ملے گی نہیں

"میں کس طرح یقین کر سکتا ہوں کہ تم نے صغیر کے ہاتھوں انوری کو اغوا نہیں کرایا؟"— میں نے وحیدہ سے پوچھا۔

"یقین دلانے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں"— وحیدہ نے کہا۔

"پھر اُسے صغیر نے اغوا کر کے اِدھر اُدھر کر دیا ہو گا"— میں نے کہا — "اُس نے انوری کو تمہارے اور حنیظ کے درمیان سے ہٹا دیا ہو گا۔"

وحیدہ پریشان ہو گئی اور وہ رونے پر آ گئی۔

"آپ تھانیدار ہیں"— اُس نے دُکھی ہوئی آواز میں کہا — "آپ پہلے بھی مجھے حوالات میں بند کر چکے ہیں۔ اب پھر حوالات میں ڈال دیں۔ میں آپ کو روک نہیں سکتی۔ میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتی کہ میرے جذبات کو سمجھیں"— اُس کے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے کہا — "میں بہت پریشان ہوں۔ جس طرح میرے یہ دن گذر رہے ہیں وہ میں ہی جانتی ہوں لیکن یہ آپ کا مسئلہ نہیں۔ آپ کو اپنی ڈیوٹی پیاری ہے۔ مجھ پر آپ کو شک ہے۔ آپ اپنی کارروائی کریں۔"

میں نے یہ کارروائی کی کہ وہاں سے اٹھا اور وحیدہ سے کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف چل پڑا۔ وحیدہ میرے آگے آ گئی۔

"اگر آپ اس طرح خاموشی سے چلے گئے تو میں بہت پریشان رہوں گی"— وحیدہ نے کہا — "مجھے بتا کر جائیں کہ میرے متعلق آپ کا فیصلہ کیا ہے اور آپ کو مجھ پر یقین آیا ہے یا نہیں۔"

"ہاں وحیدہ!"— میں نے کہا — "مجھے تم پر یقین ہے۔"

میں نے اپنا فیصلہ اُسے خوش کرنے کے لیے نہیں سنایا تھا۔ میرا تجربہ اور

میری فالتو حس بتا رہی تھی کہ انوری کو وحیدہ نے اغوا نہیں کرایا، بلکہ میری رائے تو یہ تھی کہ انوری اغوا ہوئی ہی نہیں، وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ میں آپ کو ایک بار پھر بتا دیتا ہوں کہ میں اس کیس میں ویسی دلچسپی نہیں لے رہا تھا جیسی میں دوسری وارداتوں میں لیا کرتا تھا۔

میں نے دوسرے دن صغیر کو تھانے میں بلوایا۔ اُس نے تسلیم کیا کہ وہ حفیظ کے پاس گیا تھا اور حفیظ کو اُس نے دھمکی دی تھی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ وحیدہ کے گھر گیا تھا۔ وحیدہ کے ساتھ اُس کی جو باتیں ہوئی تھیں، اُس نے وہ بھی مجھے سنائیں لیکن اُس نے یہ تسلیم نہ کیا کہ اُس نے انوری کو اغوا کیا ہے۔

میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ صغیر نیم پاگل سا آدمی تھا، یا آپ اسے ابنارمل ذہن کا آدمی کہہ سکتے ہیں۔ مریض سا لگتا تھا۔ یہ چرس کے اثرات تھے۔ اُس کے بولنے میں ٹھہراؤ سا تھا۔ کم بولتا تھا اور اُس کے بولنے کے انداز میں نشے کا اثر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس پر ایک حربہ استعمال کیا۔

"اگر تم نہیں مانو گے تو میں وحیدہ کو حوالات میں بند کر دوں گا"۔۔۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ "مجھے شک ہے کہ تم نے وحیدہ کے سہاگ کو بچانے کے لئے انوری کو درمیان سے اٹھا دیا ہے۔"

"ملک صاحب!"۔۔۔ اُس نے دھیمی مگر صاف اور پختہ آواز میں کہا۔۔۔ "وحیدہ کو تھانے میں نہ بلانا۔ اگر آپ کو اُس پر شک ہے تو مجھے گرفتار کر لیں اور جو بیان آپ کا کام کر سکتا ہے وہ لکھ کر اس پر میرے دستخط کرا لیں لیکن آپ کو انوری ملے گی نہیں۔ میں آپ کی سزا قبول کروں گا لیکن آپ کو انوری کہاں سے دوں گا؟.... میں آپ کو ایک بات ضرور کہوں گا۔ آپ ایک بدمعاش ماں کی بدچلن بیٹی کے پیچھے ایک غیرت مند عورت کو ذلیل کر رہے ہیں۔ وحیدہ پہلے ہی بدنام ہو چکی ہے۔ میں آپ کو صاف بتا دیتا ہوں کہ حفیظ اگر کچھ دن اور اُسے اپنے گھر نہ لے گیا تو پھر میں بتا نہیں سکتا کہ حفیظ کے ساتھ میرا سلوک کیا ہوگا۔"

میں نے اپنی تسلی کے لیے صغیر سے خاصی لمبی چوڑی پوچھ گچھ اور جرح کی لیکن وہ اپنی پٹڑی سے نہ اُترا۔

کلہاڑی پھر چل گئی

میں چار پانچ دن دوسرے کیسوں اور کاموں میں مصروف رہا۔ انوری کی گمشدگی کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ ایک رات نو بجے کا وقت ہوگا۔ وہ قصبہ تھا۔ نو بجے تک اس پر نیند کی خاموشی طاری ہو جاتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے آدھی رات کا وقت ہو۔ مجھے گھر سے تھانے بلایا گیا۔ وہاں ایک تو صغیر تھا اور چار پانچ معمولی سے آدمی تھے جن میں دو تکیئے کے ملنگ تھے۔ ان ملنگوں اور صغیر کے علاوہ میں دو اور آدمیوں کو جانتا تھا۔ وہ جرائم پیشہ اور سزا یافتہ تو نہیں تھے لیکن وہ شریف بھی نہیں تھے۔ کہیں کوئی کام مل جاتا تو کر لیتے تھے، ویسے ان کا پیشہ جُوتے بازی تھا۔

انہوں نے بتایا کہ خانقاہ سے پرے ان کا ایک ساتھی بہت بُری طرح زخمی پڑا ہے۔ ابھی زندہ ہے۔ اگر اُسے اٹھانے میں جلدی نہ کی گئی تو وہ مر جائے گا۔ یہ لوگ بہت بھڑکے ہوئے تھے۔ کہتے تھے کہ انہیں پتہ چل جاتا کہ اُن کے دوست کو کس نے زخمی کیا ہے تو وہ تھانے نہ آتے، پھر اُس کی لاش تھانے میں آتی اور آپ کو کبھی پتہ نہ چلتا کہ قاتل کون ہے۔

یہ لوگ تکیئے پر جُوا کھیلا کرتے تھے۔ یہ سب قبرستان کے اس تکیئے میں تھے۔ صغیر تکیئے کی طرف جا رہا تھا۔ اُسے خانقاہ کے قریب یہ آدمی پڑا نظر آیا۔

اُس نے ماچس جلا کر اسے پہچانا اور تکیئے تک دوڑتا گیا۔ اُس زمانے میں زخمی کو سب سے پہلے پولیس دیکھا کرتی تھی۔ ان لوگوں نے ایک آدمی کو زخمی کے پاس چھوڑا اور سب تھانے میں آ گئے۔ میں اپنے سٹاف کے تین چار آدمی ساتھ لے کر موقعۂ واردات کی طرف چل پڑا۔

وہاں جا کر زخمی کو دیکھا۔ اُس کی حالت بالکل وہی تھی جس میں میں نے بختیار کو زخمی پڑے دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ بختیار کے زخم مختلف جگہوں پر تھے۔ اس آدمی کے زخم بھی کلہاڑی کے تھے۔ صرف دو زخم تھے۔ ایک پیٹھ پر اور دوسرا کندھے پر۔ دونوں گہرے تھے۔ کندھے کی ہڈی بازو کے جوڑ کے قریب ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں جب اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے نحیف آواز میں کہا — "اُس کی ٹانگ پر میرے چاقو کا زخم ہوگا۔"

"کون تھا وہ؟" — میں نے پوچھا۔

اُس نے سرگوشی کی — "پتہ نہیں۔"

وہ اس سے زیادہ نہ بول سکا۔ بے ہوش ہوگیا۔ ملنگ چارپائی لے آئے تھے۔ میرے کہنے پر وہ زخمی کو چارپائی پر ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ کر دیا۔ اُسے کہا کہ ڈاکٹر سے کہے کہ اس کا بیان لینا ہے۔ جونہی ہوش میں آئے مجھے بلا لے۔

انوری کی گمشدگی کی طرح یہ کیس بھی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ مضروب معمولی سا آدمی تھا بلکہ اس لئے کہ وہ جواری تھا۔ جُوئے کی ہار جیت اور لین دین پر اس کا کسی کے ساتھ تنازعہ ہوگا۔

دوسرے آدمی نے تنازعہ ختم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہوگا۔ ملزم انہی لوگوں میں تھا جسے پکڑنا مشکل نہ تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ ملزم پکڑا گیا تو ان کا راضی نامہ کرا دوں گا۔ مضروب نے بے ہوش ہونے سے پہلے کہا تھا کہ اُسے زخمی کرنے والے کی ٹانگ میں اُس کا چاقو لگا ہے۔ اُس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کی لڑائی ہوئی تھی۔

میں تین بڑی ٹارچیں اور ایک پیٹرومیکس گیس لیمپ ساتھ لے گیا تھا۔ کھوجی کو لانے کے لئے ایک آدمی کو بھیجا تو پتہ چلا کہ وہ گھر نہیں ہے۔ اُسے صبح تک واپس آنا تھا۔ میں نے ٹارچوں اور گیس لیمپ کی روشنی میں خود ہی کھُرے دیکھنے شروع کر دیئے۔ اُس روز پھوہار پڑی تھی۔ وہ جگہ اور اس کے ساتھ کے میدان کی مٹی دھول والی تھی۔ پھوہار خشک ہو چکی تھی۔ اس پر کھُرے

بالکل صاف تھے۔ ایک کھُرا مجھے قصبے کی طرف لے گیا۔ یہ موقعۂ واردات کی طرف آیا اور واپس جا رہا تھا۔

موقعۂ واردات سے پانچ چھ قدم دُور ایک لمبا چاقو پڑا تھا۔ یہ کھُلا ہُوا تھا اور اس کے بلیڈ پر خون لگا ہُوا تھا۔ یہ وہی چاقو معلوم ہوتا تھا جو مضروب نے اپنے حریف کو مارا تھا۔ میں اور آگے چلا گیا۔ آگے کسی نے کچھ زمین کے اردگرد پانچ ساڑھے پانچ فُٹ اونچی دیوار پھیر رکھی تھی۔ کھُرا دیوار کے ساتھ ساتھ واپس جا رہا تھا۔

دیوار کے ساتھ ایک جگہ کھُرا رُک گیا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی دیوار کے اندر ماری۔ میرا قد دیوار سے اونچا تھا۔ اندر اینٹوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کلہاڑی پڑی ہوئی تھی۔ میرے کہنے پر ایک کانسٹیبل دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور کلہاڑی اٹھا لایا۔ یہ خون آلود تھی۔ کانسٹیبل کے پاس ٹارچ تھی جس کی روشنی میں اُس نے زمین دیکھی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اندر کوئی کھُرا نہیں ملا۔ میں سمجھ گیا۔ دیوار کے باہر کھُرا رُک گیا تھا۔ یہاں سے اس آدمی نے کلہاڑی دیوار کے اندر پھینکی تھی۔ میں کھُرا دیکھتا گیا اور ایک گلی تک چلا گیا۔ گلی پکّی تھی۔ وہاں کھُرا نہ ملا۔ میں نے کھُروں کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر دیا۔

چاقو اُس کی ران میں رہ گیا

میں ہسپتال چلا گیا۔ مضروب کے ساتھی اُسے اپنا خون دے رہے تھے۔ ان میں جو باہر کھڑے تھے، میں نے اُن سے پوچھنا شروع کر دیا کہ مضروب کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا چل رہا تھا یا کسی کے ساتھ اُس کی دشمنی تھی؟ سب نے کہا کہ اس کی دشمنی کسی کے بھی ساتھ نہیں تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ اس پر حملہ نہیں ہُوا بلکہ اس کی کسی کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے۔ اگر وہ آدمی مل گیا تو ان کا راضی نامہ کرا دیں گے۔ میری یہ بات سنتے ہی سب بول پڑے۔ کہنے لگے کہ وہ پرچہ کرائیں گے اور ملزم کو کسی قیمت پر نہیں بخشیں گے۔

یہ سب مجرمانہ زندگی بسر کرنے والے لوگ تھے۔ پولیس سے نہیں ڈرتے تھے کیونکہ ان کا واسطہ پولیس سے پڑتا رہتا تھا۔ بعض وارداتوں کی تفتیش میں یہ پولیس کی مدد بھی کرتے تھے۔ اناڑی یا رشوت خور تھانیداروں کو یہ لوگ مشتبہ افراد مہیا کرتے تھے تاکہ تھانیداروں کے روزنامچے کا پیٹ بھرتا رہے۔ پاکستان میں یہ لوگ سیاسی پارٹیوں کے کارکن ہوتے ہیں۔ الیکشن کسی بھی قسم کا ہو، یہ لوگ بہت کام کرتے ہیں۔

ان سب نے مجھے گھیر لیا۔ وہ کہتے تھے کہ ملزم کو پکڑو۔ ایک نے کہا کہ ملزم کو اگر پولیس نے پکڑ کر سزا نہ دلائی تو وہ خود ملزم کو پکڑ لیں گے اور اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ مضروب تکیے تک نہیں پہنچا تھا، وہ تکیے کی طرف جا رہا تھا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ مضروب صبح سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا اور یہ بھی کہ یہ مرے گا نہیں۔ یہ بالکل بختیار جیسا کیس تھا۔ میں تھانے چلا گیا۔ مضروب

کے ساتھ جو آدمی تھے، ان میں سے تین میرے ساتھ آئے۔ وہ رپورٹ لکھانے آئے تھے۔

رات تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ میں تھانے میں یہ کہہ کر گھر چلا گیا کہ ہسپتال سے کوئی اطلاع آئے تو مجھے بلا لیں۔ میں گھر جا کر سو گیا۔ ایسے لگا جیسے میں چند منٹ ہی سویا ہوں گا کہ مجھے جگا دیا گیا۔ سورج نکل رہا تھا۔ ہسپتال سے اطلاع آئی تھی کہ مضروب ہوش میں آ گیا ہے۔ میں ہسپتال گیا۔ مضروب کو دیکھا۔ وہ پوری طرح ہوش میں تھا۔

"جانتے ہو تمہیں کس نے زخمی کیا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"نہ جی!" — اُس نے جواب دیا — "یہ معلوم ہوتا تو آپ تک رپورٹ نہ پہنچتی۔ ایسے آدمیوں کے فیصلے ہم خود کر لیا کرتے ہیں۔"

"اب بتاؤ تم پر حملہ کس طرح ہُوا ہے۔"

"میں تکیے کی طرف جا رہا تھا" — اُس نے بتایا — "خانقاہ سے ابھی میں تھوڑی ہی دُور تھا کہ بائیں طرف سے ایک آدمی بڑا تیز چلتا آیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ کلہاڑی اٹھائے میرے اوپر آ رہا ہے۔ قریب آ کر اُس نے کلہاڑی اٹھائی تو مجھے ہوش آیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے دو کام کیے۔ ایک یہ کہ کلہاڑی سے بچنے کے لئے ایک طرف جھکا اور دوسرا یہ کہ اپنی جیب سے چاقو نکالا۔ اُس کی کلہاڑی میرے کندھے پر پڑی۔ اگر میں ایک طرف جھک نہ جاتا تو کلہاڑی میرے سر پر پڑتی۔ وہ دوسرے وار کے لئے ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ میں نے چاقو کھول لیا لیکن اُس نے ایک اور وار کر دیا۔ میرے گھٹنے زمین سے لگ گئے۔ وہ میرے بہت قریب تھا۔ میں نے اُس کی ران پر پوری طاقت سے چاقو مارا۔ میرا خیال ہے کہ چاقو گہرا اُتر گیا تھا۔ میں نے چاقو باہر کھینچنے کی بجائے نیچے کو کھینچا۔ اس طرح اُس کا زخم لمبا ہو گیا ہو گا....

"اُس نے میری پیٹھ پر کلہاڑی ماری لیکن زیادہ زور کی نہ لگی۔ چاقو میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ آدمی پیچھے کو دوڑا۔ میرا خیال ہے چاقو ابھی اُس کی ران میں ہی تھا۔ میں اٹھا۔ وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا۔ میں تکیے کی

طرف چل پڑا لیکن چکر آ گیا اور میں بیٹھ گیا۔ اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں لڑھک گیا۔ لیٹے لیٹے سرکنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی مشکل لگا۔ اتنے میں صغیر آ گیا اور اُس نے مجھے دیکھا اور وہیں سے اس نے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ تکئے میں جو کوئی بھی تھا وہ آ گیا۔ انہوں نے مجھے پانی پلایا اور آپ کو اطلاع دی۔"

میں نے اُس سے کرید کرید کر پوچھا کہ کسی کے ساتھ اُس کا لڑائی جھگڑا ہُوا ہو گا یا کوئی دشمنی ہو گی۔ اُس نے بتایا کہ کسی کے ساتھ ایسی دشمنی نہیں کہ قتل تک نوبت پہنچے۔

اِس کے کچھ اور ساتھی ہسپتال آ گئے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں تفتیش کروں گا لیکن وہ خود بھی ٹوہ لگانے کی کوشش کریں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ ٹوہ لگا لیں گے۔ ان میں دو آدمی جرائم پیشہ اور سزا یافتہ بھی تھے۔ پولیس کے لیے مخبری یہی لوگ کیا کرتے تھے۔ میں نے تھانے جا کر یہ کیس اپنے اے۔ ایس۔ آئی کے حوالے کر دیا۔

نوزائیدہ بچے کی لاش

دو دن گذر گئے۔ اس واردات کے ملزم کا کوئی سراغ نہ ملا۔ تیسری صبح طلوع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی بڑی منحوس اطلاع آئی۔ خانقاہ یعنی قبرستان کے قریب جو کھڈوں کا علاقہ تھا وہاں ایک نوزائیدہ بچے کی لاش پڑی ہوئی دیکھی گئی۔ یہ لاش قصبے کے دو آدمیوں نے دیکھی تھی۔ وہ تھانے میں آ گئے اور مجھے بتایا کہ بچے کا چہرہ صاف اور صحیح ہے، باقی دھڑ کھایا ہُوا ہے۔

یہ قتل کا کیس تھا۔ میں وہاں پہنچا.... اُف میرے خدایا! کیا یہ بھی مجھے دیکھنا تھا — ایک بچّہ میرے سامنے اس حالت میں پڑا تھا کہ اُس کا چہرہ بالکل صحیح تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ ذرا سے کھلے ہُوئے تھے۔ دونوں بازو کندھوں سے الگ تھے۔ ننھا سا ایک ہاتھ قریب ہی پڑا ہُوا تھا۔ دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ پیٹ اور سینہ کھائے جا چکے تھے۔ چھوٹی چھوٹی پسلیاں رہ گئی تھیں۔ بچے کا چہرہ بتاتا تھا کہ یہ بچہ اس دنیا میں آیا لیکن اسے دن کی روشنی دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔

میں بڑا سخت جان آدمی ہُوا کرتا تھا۔ میرا دل بہت مضبوط تھا۔ میں اُس وقت تک بہت سی لاشیں دیکھ چکا تھا۔ یہ مقتولوں کی لاشیں تھیں۔ ان میں بعض کی حالت ایسی تھی کہ آپ میں سے کوئی دیکھ لیتا تو بیہوش ہو جاتا۔ بعض کی آنکھیں نکلی ہوئی تھیں۔ پیٹ پھٹے ہوئے۔ ٹانگیں اور بازو الگ کر کے ساتھ رکھے تھے۔ بعض لاشیں جو بند کمروں میں تین چار دن پڑی رہیں، سُوج گئی تھیں۔ یہ سب میں نے دیکھا۔ میں نے چار لاشوں کا پوسٹمارٹم

ہوتے دیکھا تھا۔ میرے دل کو کچھ نہیں ہوتا تھا لیکن اِس بچّے کی لاش دیکھ کر میرا دل گھبرا گیا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے میں غم سے نڈھال ہو گیا ہوں۔ چھ ماہ پہلے میرا پہلا بچّہ پیدا ہُوا تھا۔ میں نے اُسے پیدائش سے نصف گھنٹہ بعد دیکھا تھا۔ چھ ماہ بعد میں بالکل اُسی جیسے بچے کی لاش دیکھ رہا تھا۔ میرے جذبات میں زلزلے بپا ہونے لگے۔ میں شاید اپنے وجود کے اندر کانپ رہا تھا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میری تمام سروس میں نوزائیدہ بچے کا قتل میرا واحد کیس تھا۔ اُس زمانے میں ایسی درندگی نہیں ہوتی تھی۔ جب پاکستان بن گیا اور کراچی شہر کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ گئی تو نوزائیدہ بچے کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دینے کا جرم عام ہو گیا تھا۔ اگر آپ ۱۹۴۷ء سے لے کر پانچ چھ سال بعد تک کے کراچی کے اخبار دیکھیں تو آپ کو آٹھ دس دنوں میں ایک خبر ایسی نظر آئے گی کہ صبح سویرے فلاں جگہ گلی میں یا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ایک نوزائیدہ بچہ زندہ یا مردہ پڑا پایا گیا۔ بعض بچّے زندہ ہوتے تھے۔

یہ بدقسمت بچے نئی تہذیب کی، یا روپے پیسے کی ہوس کی، یا غربت کی پیداوار تھے۔ کراچی میں ناجائز نوزائیدہ بچوں کو باہر پھینک دینا لوگوں کے لیے کوئی عجوبہ نہیں رہا تھا۔ یہ وبا پاکستان کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی پہنچ گئی تھی۔ آجکل اخلاقی حالت بہت بگڑ گئی ہے لیکن تہذیبِ جدید کے ساتھ ایسے انتظامات بھی آ گئے ہیں جو بچے کی پیدائش تک نوبت ہی نہیں آنے دیتے۔

میں جس وقت کی بات سنا رہا ہوں، اُس وقت قتل کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ بڑے گھناؤنے جرائم بھی ہوتے تھے لیکن نوزائیدہ بچے کو باہر پھینکنے کا جرم میرے لیے بالکل نیا اور بڑا ہی تکلیف دہ تھا۔ میرے ذہن میں ایک شک یہ آیا کہ بچّہ مُردہ پیدا ہُوا ہو گا اور یہ ہندوؤں یا سکھوں کا ہو گا۔ اگر مسلمانوں کا ہوتا تو اسے باقاعدہ دفن کرتے اور جنازہ پڑھتے لیکن یہ خیال بھی آیا کہ بچہ اگر مردہ ہی پیدا ہو، کوئی ماں باپ بچے کی لاش کو اس طرح نہیں پھینکتے۔

یہ مردہ پیدا ہُوا تھا یا زندہ، مجھ پر اس بچے کی لاش نے بہت بُرا اثر

کیا۔ میں بچے کے معصوم چہرے کو دیکھتا رہا اور خیالات مجھے کہاں سے کہاں لے گئے۔ انسان کسقدر پاک اور معصوم پیدا ہوتا ہے مگر جن انسانوں میں اس کا شعور بیدار ہوتا ہے وہ اسے کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ اس بچے کو تو اتنی ہوش ہی نہیں تھی کہ وہ محسوس کرتا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے اور خدا کی اتنی پیاری تخلیق کو خدا کے بندوں نے مٹی میں ملا دیا ہے۔

میں اچانک اپنے آپ میں آ گیا اور موقعۂ واردات کو دیکھنے لگا۔ بچے کو مٹی میں دبایا گیا تھا۔ اسے گیدڑوں وغیرہ نے نکال لیا اور اسے کھاتے رہے تھے۔ ارد گرد انہی کے پنجوں کے نشان تھے۔ بعد میں کھوجی نے ایک دو کُھرے موقعۂ واردات سے تھوڑی دُور دیکھے تھے لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ بچے کو یہاں پھینکنے والوں کے کُھرے ہیں۔

مجھے کُھروں کی ضرورت نہ رہی کیونکہ وہاں ایک کپڑا پڑا تھا۔ یہ چادر کا ایک ٹکڑا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ بچے کو اس میں لپیٹ کر یہاں لایا گیا ہے۔ میں نے اس کپڑے کو غور سے دیکھا۔ اس پر بچے کے جسم کی نمی تھی جس پر مٹی جم گئی تھی۔ میں نے اس کے کونے دیکھے اور میں جو چیز دیکھنا چاہتا تھا وہ نظر آ گئی۔ یہ دھوبی کا نشان تھا جو اس ٹکڑے کے کونے میں تھا۔ اُس زمانے میں عورتیں تمام کپڑے خود دھویا کرتی تھیں۔ روپے پیسے والے لوگوں کے کپڑے دھوبی کے پاس جایا کرتے تھے یا وزنی اور بڑے کپڑے یعنی چادریں اور کھیس دُھلائے جاتے تھے۔ چادر کا یہ ٹکڑا موٹے کپڑے کا تھا۔

میں نے ایک اور کپڑا منگوایا اور کاغذی کارروائی کر کے بچے کی لاش کے ٹکڑے اس کپڑے میں بندھوائے اور ہسپتال بھیج دیے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے جو میرے ساتھ تھا، کہا کہ وہ یہاں کے دھوبیوں کو تھانے لے چلے۔

وہ آگے آگے چل پڑی

تھوڑی ہی دیر بعد ہیڈ کانسٹیبل دو دھوبیوں کو ساتھ لے آیا۔ یہ قصبہ تھا۔ وہاں یہی دو دھوبی تھے۔ میں نے انہیں کپڑے کا ٹکڑا دکھایا اور ان سے پوچھا کہ اس پر کس دھوبی کا نشان ہے اور یہ کس گھر کا کپڑا ہے۔ ایک دھوبی نے دیکھ کر کہا کہ یہ اُس کا نشان نہیں۔ دوسرے نے پہچان لیا اور انوری اور راحیلہ کے باپ کا نام لے کر کہا کہ یہ اُس کے گھر کا کپڑا ہے۔

مجھے یاد آگیا کہ جب میں بختیار پر قاتلانہ حملے کی تفتیش کر رہا تھا تو انوری، راحیلہ اور ان کی ماں کو تھانے بلایا تھا۔ میں جب راحیلہ کا بیان لے رہا تھا تو اُسے دو تین بار اُبکائی آئی تھی۔ اُن دنوں اُس کے تعلقات بختیار کے ساتھ تھے۔ میں نے راحیلہ سے پوچھا تھا کہ اُسے اُبکائی کیوں آئی ہے۔ مجھے یہی شک ہُوا تھا کہ گناہ اپنا رنگ دکھا رہا ہے لیکن راحیلہ نے کہا تھا کہ جب کبھی کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے جس سے اُسے گھبراہٹ ہو تو اُسے اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔ میں نے اسے صحیح تسلیم کر لیا تھا۔ مجھے اس سلسلے میں زیادہ کریدنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

اب دھوبی نے اُس کے باپ کا نام لیا تو میں نے حساب لگایا۔ میرے حساب کے مطابق راحیلہ کو میرے پاس آئے آٹھ مہینے گزر چکے تھے۔

اب مجھے پتہ چلا کہ اُس کی اُبکائیاں کس وجہ سے تھیں۔

میں نے اُسی وقت ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور راحیلہ کے محلے میں جا پہنچا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں میں مسلمانوں کی رسوائی ہو رہی تھی۔ میں مجبور تھا۔ اس مسلمان گھرانے پر

پردہ ڈالنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ انوری کی گمشدگی کے سلسلے میں اُس کی ماں نے مجھے بتایا تھا کہ راحیلہ کی چونکہ بہت بدنامی ہو گئی تھی اس لئے اُسے خالہ کے پاس بھیج دیا گیا ہے۔ اب جبکہ میں اس گھر پر چھاپہ مارنے کے لیے پہنچ گیا تھا تو مجھے خیال آیا کہ اندر جا کر پتہ چلا کہ راحیلہ تو یہاں ہے ہی نہیں تو مجھے بہت شرمندہ ہونا پڑے گا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے یہ واردات کسی غریب عورت کی ہو۔ اُس نے راحیلہ کے گھر سے شاید لیا ہوا کپڑا بچے کو لپیٹنے میں استعمال کیا ہوگا۔

مجھے محلے کے دو معزز آدمیوں کو ساتھ لینا تھا۔ وہ میں نے ساتھ لے لئے۔ کچھ سوچ کر میں ان میں سے ایک کے گھر بیٹھ گیا اور اُسے کہا کہ وہ راحیلہ کے باپ کو بُلا لائے۔

آٹھ دس منٹ بعد وہ شریف آدمی جو راحیلہ کا باپ تھا میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں اُسے الگ لے گیا اور اُس سے پوچھا کہ اُس کی بیٹی راحیلہ کہاں ہے؟

وہ چُپ چاپ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"بڑے میاں!"۔۔۔ میں نے اُسے دلی ہمدردی سے کہا۔۔۔ "مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔ اگر میں آپ کی مدد کرنے کے قابل ہوتا تو آپ کی عزت کا پورا پورا خیال رکھتا۔ اب میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ سچ بولنا۔ آپ کی بیگم اور بیٹیوں نے تمام راستے بند کر دیئے ہیں۔ میں آپ کو اس رسوائی سے کس راستے سے نکالوں؟.... نوزائیدہ بچے کی لاش ملی ہے اور شہادت ایسی ملی ہے جو مجھے آپ کے پاس لے آئی ہے.... راحیلہ کہاں ہے؟"

اس بدقسمت آدمی کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ اُس کا سر ڈولا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں کی پُتلیاں بھی سفید ہو گئی تھیں۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا اور پھر ایک طرف لڑھک گیا۔

میں نے نہ جانے کیسے کہا کہ اس شخص کو اٹھا کر ہسپتال لے جاؤ اور میں

بڑی تیزی سے ان دو معزز آدمیوں کے ساتھ راحیلہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ دروازے پر دستک دی۔ دروازہ نہ کھلا۔ دوسری بار اور پھر تیسری بار دستک دی تو اندر سے راحیلہ کی ماں کی آواز آئی۔

"میاں گھر نہیں ہیں"۔۔۔ اُس نے دروازہ کھولے بغیر کہا۔۔۔ "وہ آجائیں تو پھر آنا۔"

"میں تھانیدار ہوں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "دروازہ کھولو۔"

"گھر میں کوئی مرد نہیں ہے"۔۔۔ اندر سے آواز آئی۔۔۔ "تھوڑی دیر بعد آنا۔"

"تمہارے گھر کا مرد میرے ساتھ ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "دروازہ نہیں کھولو گی تو میں دروازہ توڑ کر اندر آجاؤں گا۔"

کواڑ آہستہ آہستہ کھلا۔ راحیلہ کی ماں کو میں نے دیکھا۔ وہ کواڑ کے پیچھے ہو گئی۔ میں اندر چلا گیا۔ دو گواہ میرے ساتھ تھے۔ میں نے ان کی موجودگی میں راحیلہ کی ماں سے پوچھا کہ راحیلہ کہاں ہے۔

"وہ اپنی خالہ کے ہاں گئی ہوئی ہے"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا۔"

"پھر میں سارے گھر کی تلاشی لوں؟"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "کیا تم اپنی بے عزتی کرانے پر تُلی ہوئی ہو؟ فوراً بتاؤ راحیلہ کہاں ہے۔"

وہ آگے آگے چل پڑی۔

رونے کے سوا کیا کر سکتی تھی!

ڈیوڑھی سے صحن میں گئے۔ برآمدے میں سے گزرے اور ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ بدبُو نے میرا استقبال کیا۔ راحیلہ کی ماں مجھے اگلے کمرے میں لے گئی اور اُس نے اگلے کمرے کے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ میں دروازے میں داخل ہُوا تو وہ عورت دروازے سے باہر نکلنے لگی۔ اُس کی ڈیل ڈول اور لباس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ اس خاندان کی عورت نہیں۔ وہ دائی ہو سکتی تھی۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور اُسے اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا۔ کمرہ بدبُو سے بھرا ہُوا تھا۔

دیوار کے ساتھ پلنگ پر راحیلہ لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ سسکیاں لینے لگی اور اُس نے اپنے منہ پر چادر ڈال لی۔ میں نے آگے بڑھ کر چادر ہٹا دی۔

"بچہ ہُوا ہے؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

وہ اور زیادہ رونے لگی۔ اُس کی ماں پاس کھڑی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا، بچہ ہُوا ہے؟

"مُردہ بچہ پیدا ہُوا تھا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "اُسے دفن کر آئے تھے۔"

"کہاں؟"

"مجھے کسی نے جگہ نہیں بتائی"۔۔۔ راحیلہ کی ماں نے جواب دیا۔

"تم دائی ہو؟"۔۔۔ میں نے اُس عورت سے پوچھا جو کمرے سے نکل رہی تھی۔

"جی۔"

"بچہ مُردہ پیدا ہُوا تھا؟"

وہ چُپ رہی۔ گھبراہٹ سے اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں نے اپنا سوال نہ دُہرایا۔ مجھے نفتیش تھانے میں کرنی تھی۔

سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ بچہ زندہ پیدا ہُوا تھا یا مردہ۔ راحیلہ کو میں اس حالت میں تھانے نہیں بلا سکتا تھا۔ اُس سے وہیں پوچھ گچھ کرنے کے لیے میں نے سب کو کمرے سے نکال دیا۔ میں راحیلہ کے پاس اکیلا رہ گیا اور اُس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ نوجوان لڑکی تھی۔ روتی ہی چلی جا رہی تھی۔ جس مصیبت میں وہ پھنس گئی تھی اس میں وہ رونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُسے سہارے اور ہمدردی کی ضرورت تھی۔ میں نے یہ ضرورت الفاظ میں پوری کرنی شروع کر دی۔

"کیا آپ مجھے گرفتار کریں گے؟"

"یہ تمہیں کس نے بتایا ہے کہ میں تمہیں گرفتار کرنے آیا ہوں؟"—— میں نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا —— "مجھ سے تمہیں ہمدردی اور پیار ملے گا لیکن یہ اُسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ تم مجھے ہر بات بالکل صحیح بتا دو۔"

"انہوں نے میرے بچے کو مار ڈالا ہے"—— اُس نے کہا اور ایسی روئی کہ اُس کی ہچکی بندھ گئی۔

"کیا بچہ زندہ پیدا ہُوا تھا؟"

"بالکل زندہ"—— اُس نے سسکتے ہوئے جواب دیا —— "میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا۔ اُس کا رونا سنا تھا اور دائی کے یہ الفاظ سنے تھے کہ لڑکا ہے۔ میں نے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ دائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماں نے دائی کو سر سے اشارہ کیا پھر دونوں بچے کو دوسرے کمرے میں لے گئی تھیں۔ مجھے بچے کے رونے کی آواز آتی رہی۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ پھر بچے کا رونا بھی بند ہو گیا۔ ماں میرے پاس آئی اور اُس نے کہا —— 'خدا کا شکر ہے، بچہ مرا ہُوا پیدا ہُوا ہے۔ دائی اُسے دفن کرنے کے لئے لے گئی ہے'—— میں

رونے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔"

"کیا تم بچے کو زندہ رکھنا چاہتی تھیں؟"

"کیا ماں اپنے بچے کو مار سکتی ہے؟"—— اُس نے کہا —— "کیا ماں برداشت کر سکتی ہے کہ اُس کے بچے کو کوئی مار ڈالے؟"—— وہ بولتے بولتے چُپ ہو گئی پھر اچانک پھٹ کر بولی —— "مجھے اپنی ماں سے نفرت ہے۔ یہ ماں نہیں ڈائن ہے۔ اس نے میرا بچہ مار ڈالا ہے۔"

"بختیار کو معلوم تھا کہ آج تمہارا بچہ پیدا ہو گا؟"—— میں نے پوچھا —— "وہ تمہارے پاس آتا رہتا ہو گا.... یہ بچہ اُسی کا ہے نا!"

"اور کس کا ہو سکتا ہے؟"—— اُس نے کہا —— "یہ واحد آدمی ہے جس کے ساتھ میرے اس قسم کے تعلقات پیدا ہوئے تھے مگر وہ کمینہ اور رذیل آدمی ہے۔ تین مہینے گزر گئے ہیں، وہ یہاں نہیں آیا۔ اُس نے میرے ساتھ شادی کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے جب پتہ چلا کہ میں اُس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو میں نے اور میری ماں نے اُسے کہا کہ شادی فوراً ہو جانی چاہیئے، ورنہ بہت بدنامی ہو گی۔ اُس نے کہا کہ فوراً ہو جائے گی۔ ایک روز اُس نے مجھے سونے کی انگوٹھی دی۔ کہنے لگا کہ یہ منگنی کی انگوٹھی ہے۔ میں خوش ہو گئی، پھر وہ مجھے تحفوں سے خوش کرتا رہا مگر یہاں آنا کم کر دیا۔ پھر اُس نے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا۔"

"کیا تم اپنی خالہ کے پاس چلی گئی تھیں؟"

"نہیں"—— اُس نے کہا —— "یہ آپ کو میری ماں نے بتایا ہو گا.... اُس نے مجھے تین مہینوں سے اس کمرے میں قید کر رکھا ہے۔ میں رات کو کمرے سے نکلتی ہوں۔ اگر دن کو نکلوں تو بھی کوئی خطرہ نہیں کیونکہ ہمارے گھر میں محلے کی کوئی عورت نہیں آتی۔ ہم لوگ اتنے بدنام ہو گئے ہیں کہ اس گھر میں نہ کوئی عورت آتی ہے نہ کوئی عورت اپنی بیٹی کو یہاں آنے دیتی ہے۔ ہمارے گھر میں کسی کا بچہ بھی نہیں آتا۔ اگر میں سارا سارا دن کمرے میں بند نہ رہتی تو بھی کسی کو پتہ نہ چلتا کہ میں کس جسمانی حالت میں ہوں۔"

میں بڑی ہی گہری سوچ میں گم ہوگیا۔ راحیلہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن میں اپنی سوچ میں اُلجھ گیا تھا۔ راحیلہ بہت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے پر زچگی کی تکلیف کے آثار تھے لیکن اُس کی معصومیت جو کنواری لڑکیوں کے چہرے پر ہوتی ہے وہ بھی اُس کے چہرے پر باقی تھی۔ وہ پردہ نشین لڑکی تھی۔ اُسے کسی شریف گھرانے کی بہو بننا تھا۔ اس کا خاوند اس پر دل و جان سے فدا ہوتا مگر ایک گناہِ کبیرہ نے اُس کی قسمت پر مہر ثبت کر دی تھی۔ اُس کا مستقبل تاریک ہوگیا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ یہ لڑکی دوسروں کے گناہوں کا شکار ہوئی ہے۔ اس کی ماں شریف عورت ہوتی اور اس میں غیرت ہوتی تو وہ نہ خود بدی کو قبول کرتی نہ اپنی بیٹیوں کو اس راستے پر ڈالتی۔ بختیار جیسے استادوں کو میں جانتا تھا۔ راحیلہ کی ماں اور بختیار کے سامنے راحیلہ نوعمری کی وجہ سے کھلونہ تھی۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ جذبات کے غلبے میں وہ ایسی آئی کہ کچلی گئی۔

پھر مجھے ایک خیال اور آیا۔ ناجائز بچہ اکیلی راحیلہ نے پیدا نہیں کیا تھا۔ بختیار جو بچے کا باپ تھا، اس جرم میں برابر کا شریک تھا مگر وہ قانون کی دسترس سے باہر تھا۔ ناجائز بچہ پیدا کرنا اتنا بڑا جرم نہیں تھا، سنگین جرم تو یہ تھا کہ بچے کو قتل کر کے باہر پھینک دیا گیا تھا۔ اس کی سزا صرف راحیلہ کو مل رہی تھی۔ بختیار کے خلاف تو یہ جرم بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس ناجائز بچے کا باپ وہ ہے۔

آپ مجھے بے ایمان کہیں، کچھ کہیں، میں نے تہیہ کر لیا کہ بختیار کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ سب سے بڑا مجرم تھا اور کھلا پھر رہا تھا۔ میرا ایمان اور میرا کردار برداشت نہ کر سکا کہ ایک نوعمر لڑکی کو سب کے گناہوں کی سزا ملے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرے دل میں بختیار کی نفرت بھر گئی تھی۔ تھانیدار کو غیر جانبدار ہونا چاہیے لیکن میں بختیار کو اس جرم میں شامل کرنے پر تُل گیا۔

راحیلہ کو میں گھر میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اُسے حراست میں لینا ضروری تھا۔ یہ تو اُس کا اپنا بیان تھا کہ وہ بچے کے قتل میں شامل نہیں تھی۔ اُس کے

رونے سے مجھے یقین ہوگیا تھا کہ بچے کو اُس نے نہیں مارا۔ وہ اپنے بچے کو نہیں مار سکتی تھی۔ اس کے لئے پتھر جیسے دل کی ضرورت تھی، پھر بھی راحیلہ کو اپنی حراست میں رکھنا ضروری تھا۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ میں اُسے گرفتار نہیں کر رہا بلکہ ہسپتال میں رکھوں گا۔

وہ بہت روئی۔ بہت بدنامی تھی لیکن اب بات قانون کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ میں نے راحیلہ کی ماں اور دائی کو باقاعدہ گرفتار کر لیا اور دونوں کو دو کانسٹیبلوں کے ساتھ تھانے بھیج دیا۔ راحیلہ کی چارپائی اٹھوائی اور میں اُس کے ساتھ ہسپتال کی طرف چل پڑا۔ اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ جس کمرے میں راحیلہ نے بچے کو جنم دیا ہے اُس کمرے کو سربمہر کر دے۔

میں ابھی ہسپتال کے راستے میں ہی تھا کہ ایک کانسٹیبل تیز تیز آتا نظر آیا۔ اُس نے بتایا کہ راحیلہ کا باپ ہسپتال میں مر گیا ہے۔ پولیس کو اپنے گھر میں دیکھ کر وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ میں نے اُسے اٹھوا کر ہسپتال بھیج دیا تھا۔ اُس پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ میں تو کہتا ہوں کہ خوش قسمت تھا جو مر گیا۔ زندہ رہتا تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ ہر روز مرتا اور ہر روز زندہ ہوتا۔

میں نے اپنے عملے سے کہا کہ راحیلہ کو پتہ نہ چلے کہ اُس کا باپ مر گیا ہے۔ اُس کے دونوں بھائی ہسپتال میں اپنے باپ کے ساتھ تھے۔

وہ تیار ہو گئی

اس سرکاری ہسپتال کا ڈاکٹر ہندو تھا۔ شودیال نام تھا۔ میں نے اُسے الگ کر کے کہا کہ راحیلہ کی دیکھ بھال اور اُس کی خوراک بہت اچھی ہونی چاہیئے۔ میں نے اُسے بتایا کہ کیا ہُوا ہے۔ ڈاکٹر کو اُس کا معائنہ بھی کرنا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے یہ بھی کہا کہ وہ راحیلہ کو اُس کے باپ کی موت سے بے خبر رکھے۔

ڈاکٹر نے اُسے وارڈ میں رکھنے کی بجائے کمرے میں رکھا۔ اُس زمانے میں ہسپتالوں کے وارڈ اور کمرے خالی پڑے رہتے تھے۔ صرف ایک ڈاکٹر ہوتا تھا جس کے پاس آؤٹ ڈور مریض آتے تھے۔ راحیلہ کو ڈاکٹر نے ایک ملازم عورت دے دی۔ میں نے کمرے پر پہرہ بٹھا دیا۔ راحیلہ کو تسلّی دلاسہ دے کر میں تھانے چلا گیا۔

راحیلہ کی ماں اور دائی حوالات میں بند تھیں۔ میں نے دائی کو حوالات سے نکلوایا اور اپنے دفتر میں بٹھا لیا۔ یہ ادھیڑ عمر عورت بُری طرح ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اُس کا ڈر قائم رکھا اور پھر اس ڈر میں اضافہ کر دیا۔

"تمہارے بچے ہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"تین ہیں جی!" — دائی نے جواب دیا — "دو لڑکیاں ایک لڑکا۔"

"خاوند؟"

"زندہ ہے" — اُس نے کہا — "ایک ہندو آڑھتی کے پاس ملازم ہے۔"

"تمہارے بعد تمہارے بچوں کا کیا بنے گا؟"

وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔

"جانتی ہو اِس جرم کی کتنی سزا ہے جو تم نے کیا ہے؟"

اُس کا رنگ بدل گیا اور اُس کا منہ خوف سے کھُل گیا۔

"عمر قید" — میں نے کہا۔

اُس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں" — میں نے کہا — "لیکن تمہیں سچ بولنا ہو گا۔ ذرا سا بھی جھوٹ بولو گی تو میں تمہیں پھر حوالات میں بند کر دوں گا اور عدالت سے تمہیں سزا دلوا کر کالا پانی بھجوا دوں گا۔"

"میرے بچوں پر رحم کریں" — اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "جھوٹ نہیں بولوں گی۔"

"کیا بچہ مُردہ پیدا ہُوا تھا؟"

"جی!"

میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور میں چُپ رہا۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ جب سر اٹھایا تو میری نظریں اُس کے چہرے پر جم گئیں۔

"بچہ زندہ تھا" — اُس نے اتنی دبی ہوئی آواز میں کہا جو میں نے مشکل سے سنا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ جھوٹ بولو گی اور کچھ سچ۔"

"اب سچ بولوں گی" — اُس نے جواب دیا۔

میں وعدہ معاف گواہ بہت کم بنایا کرتا تھا لیکن اس عورت کو میں نے وعدہ معاف گواہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے پاس موقعہ کا گواہ کوئی نہ تھا۔ اس لیئے مجھے وعدہ معاف گواہ کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ ایک ضرورت اور بھی تھی۔ یہ آپ کو آگے چل کر سناؤں گا۔

"جانتی ہو وعدہ معاف گواہ کیا ہوتا ہے؟"

"سلطانی گواہ"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "سنا ہے سلطانی گواہ کو معافی مل جاتی ہے۔"

میں نے اس سے ایسی کچھ اور باتیں پوچھیں تو مجھے اندازہ ہُوا کہ عورت ہوشیار ہے۔ ایسی عورتیں ہوشیار ہی ہُوا کرتی ہیں۔ اس عورت کی تو جیسے آنکھیں بھی بولتی تھیں۔

"میں تمہیں سلطانی گواہ بنالوں گا"۔۔۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ "اور تمہیں سزا سے بچالوں گا لیکن جہاں کہیں تم نے ذرا سی بھی کوئی بات غلط بتائی تو تمہیں دُوگنی سزا ملے گی۔"

"میں اپنا جو جرم بتاؤں گی اس کی بھی معافی مل جائے گی؟"۔۔۔ اُس نے پوچھا۔

"بالکل معافی"۔۔۔ میں نے جواب دیا۔۔۔ "تمہیں اپنا بیان مجسٹریٹ کے سامنے دینا پڑے گا۔ پھر تمہیں کچھ دن جیل میں رہنا پڑے گا تاکہ تم دشمنوں سے محفوظ رہو۔"

میں نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا اور بیان کے لئے تیار کرلیا۔ وہ تیار ہوگئی اور خوش بھی ہوئی۔

بڑی خوبصورت چڑیل

"میں نے غلط کہا تھا کہ بچہ مُردہ پیدا ہُوا تھا"۔۔۔ اُس نے خود ہی کہا۔ "بچہ زندہ اور تندرست تھا۔"

"پہلے تم یہی بتادو کہ بچے کو کس طرح مارا گیا ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔ "تمہیں کب پتہ چلا تھا کہ راحیلہ کو بچہ ہونے والا ہے؟"

"مجھے تو اُسی وقت پتہ چل گیا تھا جب راحیلہ اور اُس کی ماں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ راحیلہ ماں بن جائے گی"۔۔۔ اُس نے کہا۔ "بچہ تو انوری کو بھی ہونا چاہیئے تھا لیکن قدرت کے کھیل ہیں۔ نہیں ہُوا.... بات یہ ہے جی، اس گھر کے جو راز میں جانتی ہوں وہ اور کوئی نہیں جان سکتا۔ زینو (راحیلہ کی ماں) کے ساتھ میرا بہت پرانا تعلق ہے۔ چودہ پندرہ سال ہوگئے ہیں۔ یہ عورت انسان نہیں، بڑی خوبصورت چڑیل ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ یہ انسان کے روپ میں آئی ہوئی چڑیل ہے....

"اس کے متعلق میں آپ کو بعد میں سب کچھ بتادوں گی۔ آپ نے پوچھا ہے کہ بچے کو کس طرح مارا گیا تھا۔ زینو نے مجھے شام کو ہی بلا لیا تھا۔ راحیلہ کو دردیں شروع ہوگئی تھیں۔ راحیلہ روتی تھی لیکن ماں کو جیسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ بچہ پیدا ہُوا۔ زینو پاس موجود تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ لڑکا ہے۔ اُس نے سر سے اشارہ کیا اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ میں بچے کو اٹھائے اُس کے پیچھے گئی۔ بچہ رو رہا تھا۔ رونا بچے کی صحت اور تندرستی کی نشانی ہوتی ہے۔"

"راحیلہ نے بچے کو دیکھا تھا؟" — میں نے پوچھا — "کیا وہ بھی چاہتی تھی کہ بچے کو مار کر پھینک دیا جائے؟"

"اُس نے بچہ نہیں دیکھا تھا" — دائی نے جواب دیا — "وہ بچے کو نہیں مارنا چاہتی تھی۔ میں جب بچے کو اٹھائے زینو کے پیچھے دوسرے کمرے کی طرف چلی تو راحیلہ نے مجھے آواز دے کر کہا تھا — 'خالہ! اسے میرے پاس لے آؤ' — میں نے رُک کر اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے کہا — 'خالہ نہ۔ خالہ نہ۔ امّی کو میرے پاس بھیجو.... نہ خالہ نہ۔ میرا بچہ' — اور وہ رو پڑی۔"

"تم نے اُس کی ماں سے کہا تھا کہ راحیلہ بچہ مانگ رہی ہے؟"

"کہا تھا" — اُس نے جواب دیا — "زینو بولی — 'وہ بچے کو کیا کرے گی؟ کہاں چھپائے گی اِسے؟... ختم کرا سے' — میں نے کہا کہ سانس روک دو۔ ختم ہو جائے گا.... اُس نے مجھے یہ کام کرنے کو کہا لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا۔"

"تم نے پہلے کبھی کسی کے بچے کو مارا ہے؟"

"یہ گناہ کبھی نہیں کیا" — اُس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا — "میرے ہاتھوں میں مُردہ بچے پیدا ہوئے ہیں یا دو بچے اتنے کمزور پیدا ہوئے کہ پیدا ہوتے ہی مر گئے مگر کسی کا بچہ مارنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔"

"پھر تم اِس بچے کے قتل میں کیوں شامل ہو گئی تھیں؟" — میں نے اُس سے پوچھا اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا — "ڈرو نہیں۔ تمہیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ تم سلطانی گواہ ہو۔ اب تم پولیس کی ساتھی ہو۔ میں کل سرکاری منظوری لے لوں گا۔"

"آپ کے بچے جئیں" — اُس نے کہا — "میں اس قتل میں اپنے بچّوں کو پالنے کے لیے شامل ہوئی تھی۔ میرا خاوند جو کماتا ہے وہ باہر ہی اُڑا آتا ہے۔ دیسی شراب وہ پیتا ہے۔ شراب نہ ملے تو چرس کے کش لگا لیتا ہے۔ اپنی تنخواہ کا ایک پیسہ مجھے نہیں دیتا۔ مجھ سے

کبھی کبھی پیسے لے لیتا ہے۔ میں دائی ہوں۔ ہر روز تو بچے پیدا نہیں ہوتے۔ عورتوں کی مٹھی چاپی کر کے دال روٹی پوری کر لیتی ہوں، یا پھر زینو سے مجھے کافی کچھ مل جاتا ہے۔"

"اس کام کا کیا انعام دیا ہے زینو نے؟"

"تین سَو روپیہ" — دائی نے جواب دیا — "اتنی زیادہ رقم مجھ جیسی عورت کبھی خواب میں نہیں دیکھ سکتی۔"

میں جس وقت کی بات سنا رہا ہوں، اُس وقت کا ایک روپیہ آج کے پندرہ روپوں سے بھی زیادہ کے برابر تھا۔ اس سے اندازہ کریں کہ چینی جو آج کل آٹھ اور دس روپے سیر مل رہی ہے، یہ اُس وقت چار آنے سیر ملا کرتی تھی۔ آج بکرے کا گوشت پچیس چھبیس روپے سیر ملتا ہے، یہ بھی اُس وقت چار آنے سیر ہُوا کرتا تھا۔ زینو نے دائی کو جو تین سو روپیہ دیا تھا، یہ بہت بڑی رقم تھی۔ اُس زمانے میں ڈیڑھ سو روپوں پر کرائے کا قاتل مل جاتا تھا۔

"زینو نے بچہ میرے ہاتھ میں دے دیا" — دائی نے مجھے بتایا — "اور اُس نے بچے کی شہ رگ دبا دی۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ بچہ میرے ہاتھوں میں تڑپا اور جب اُس کے جسم کی حرکت بند ہو گئی تو میں نے اِدھر دیکھا۔ بچہ مر چکا تھا" — دائی کو ہچکی سی آئی اور اُس نے دوپٹہ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

میں نے اُسے رونے ہی دیا۔

وہ تو پردے میں رہنے والی لڑکی تھی

اُس نے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور میری طرف دیکھ کر بولی ——
"آپ تو مجھے سزا سے بچالیں گے، خدا کی سزا سے مجھے کون بچائے گا؟"

"تم سچ بولتی رہو تو خدا انہیں بخش دے گا" —— میں نے کہا ——
"مجبور انسانوں کو کبھی کبھی گناہوں کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔"

اُس نے بتایا کہ بچہ مر گیا تو زینو نے اُسے کہا کہ اسے کہیں دفن کر دو۔ دائی نے کہا کہ وہ اکیلی تو کبھی نہیں جائے گی۔ دائی جرائم پیشہ نہیں تھی کہ وہ اس قدر بھیانک کام کر دیتی۔ اُس نے کہا کہ زینو بھی ساتھ چلے۔ زینو بھی ڈر گئی لیکن بچے کی لاش کو غائب کرنا ضروری تھا۔ زینو نے گھر سے رمبی اٹھائی پھر ایک کپڑا نکالا جس میں اُس نے لاش کو لپیٹا۔ راحیلہ کے کمرے کا ایک دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا تھا اور دوسرا برآمدے میں۔ زینو نے باہر سے دونوں دروازوں کی چٹخنیاں چڑھا دیں اور دونوں باہر نکل گئیں۔

"راحیلہ کا باپ اور اُس کے بھائی کہاں مرے پڑے تھے؟"

"وہ تو مرے ہوئے ہی سمجھو" —— دائی نے کہا —— "باپ کی تو گھر میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ بیوی کو روکتا ٹوکتا تو اُسے گھر سے نکال دیتی.... دونوں لڑکے لڑکیوں جیسے ہیں۔ چونکہ وہ لڑکے ہیں اس لئے باہر گھوم پھر سکتے ہیں۔ ان کی اخلاقی حالت سناتے شرم آتی ہے۔ دونوں کسی کمرے میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔"

اُس نے مجھے بتایا کہ وہ کھڈوں والی جگہ پہنچ گئیں۔ انہیں زیادہ کھدائی نہ کرنی پڑی۔ پہلے ہی ایک گڑھا بنا ہوا تھا۔ بچے کی لاش اس میں رکھی اور

اوپر مٹی ڈال دی۔ دونوں واپس آگئیں۔ دائی پر خاموشی طاری تھی۔ زینو نے اُسے کہا کہ اس راز کو اپنے سینے میں دبا کر رکھے۔ اگر راز فاش ہو گیا تو وہ بھی اس جرم میں برابر کی شریک سمجھی جائے گی۔

"واپس گھر میں آئیں تو راحیلہ سسکیاں لے لے کے رو رہی تھی" ——
دائی نے کہا —— "ہمیں دیکھتے ہی اُس نے پوچھا، بچہ کہاں ہے؟ ماں نے جواب دیا —— 'جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی چلا گیا ہے' —— راحیلہ نے اپنے منہ پر دوہتڑ مار کر ماں سے کہا —— 'تو ڈائن ہے۔ میرے بچے کو کھا گئی ہے تو' —— ماں نے اُسے پیار سے بھی سمجھایا اور اُسے گالیاں بھی دیں لیکن راحیلہ آخر ماں تھی۔ وہ بہت روئی۔ اُس نے مجھے کہا کہ اُس کا بس چلے تو وہ مجھے گھر میں داخل نہ ہونے دے۔"

دائی نے پورا بیان دے دیا۔ اُس نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ راحیلہ بچے کے قتل میں شامل نہیں تھی بلکہ قتل کے خلاف تھی۔ میں نے بختیار کے متعلق پوچھا تو اُس نے پہلے تو اُسے چند ایک گالیاں دیں پھر اگلی بات کی۔

"اگر میرا حکم چلے تو میں اس شخص کو عمر قید دلواؤں" —— دائی نے کہا —— "اُس نے پہلے بڑی بہن کو دھوکہ دیا پھر چھوٹی بہن کو رام کر لیا۔ میں یہی سنتی رہی کہ وہ راحیلہ کے ساتھ شادی کرے گا۔ اُس کے گناہ راحیلہ کے پیٹ میں رنگ لانے لگے تو زینو اور راحیلہ نے اُسے کہا کہ وہ فوراً شادی کرلے لیکن وہ انہیں ٹالتا رہا، پھر اُس نے ان کے گھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ ایک روز زینو نے مجھے کہا کہ بختیار سے کہنا کہ ہماری بہت بدنامی ہو گی۔ وہ راحیلہ کے ساتھ شادی کرلے۔ بختیار نے بڑا روکھا جواب دیا۔ اُس نے کہا کہ زینو سے کہنا کہ میں کسی شریف گھرانے میں شادی کروں گا۔ تمہیں میرے خلاف کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ میں تمہیں تمہاری بیٹیوں کی قیمت حد سے زیادہ دیتا رہا ہوں....

"میں نے اُسے کہا کہ لڑکی کی زندگی برباد نہ کرو۔ وہ تمہارے بچے کی ماں بنے گی۔ اپنے ہونے والے بچے پر رحم کرو، مگر اس پتھر دل نے کہا ——

'بدمعاش لڑکی ہے۔ مجھے کون یقین دلا سکتا ہے کہ اُس کے پیٹ میں میرا بچہ ہے' — اس کے بعد میں نے اُس کی صورت نہ دیکھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ بختیار کا بچہ تھا؟"

"سولہ آنے یقین ہے جی!" — دائی نے جواب دیا — "یہ جو کہتے ہیں کہ دائی سے پیٹ چھپے ہوتے نہیں ہوتے، یہ غلط نہیں۔ یہ دونوں بہنیں ہنسنے کھیلنے اور شوخیاں کرنے والی لڑکیاں ضرور تھیں لیکن ان کے چال چلن پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ انہیں ماں نے اور بختیار کے تحفوں اور پیسے نے خراب کیا تھا۔ انوری خراب ہو کر گھر سے بھاگی ہے۔ وہ تو پردے میں رہنے والی لڑکی تھی۔"

"تم جانتی ہو وہ کس کے ساتھ گئی ہے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "یہ ایسا راز ہے جس تک میں نہیں پہنچ سکی .... یہاں ایک آدمی ہے جس کا نام حفیظ ہے۔ اُس کی بیوی بھی ہے۔ اُس کا نام وحیدہ ہے۔ دونوں میں اتنی محبت تھی کہ ان کے درمیان سے پانی نہیں گزر سکتا تھا مگر زینو نے ان دونوں کے درمیان سے دریا گزار دیا۔ حفیظ کو انوری کے لیے پھانسا۔ انوری راحیلہ جیسی خوبصورت ہے۔ اُس نے حفیظ پر اپنا جادو چلایا۔ زینو نے اُس کے کانوں میں اُس کی بیوی کے خلاف ایسا زہر گھولا کہ اب میاں بیوی الگ الگ رہتے ہیں اور انوری کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہے۔"

"وحیدہ کیسی عورت ہے؟"

"جیسی خدا نے اُسے خوبصورتی دی ہے ویسا ہی خوبصورت اُس کا اخلاق ہے" — دائی نے جواب دیا — "کوئی مرد اُس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے تو وحیدہ اُس کی آنکھ پھوڑ دے۔"

یہ تو موٹی موٹی باتیں ہیں اور موٹے موٹے سوال جواب ہیں جو میں نے آپ کو سنائے ہیں۔ تفتیش اور پوچھ گچھ میں بہت کچھ پوچھا جاتا اور بہت وقت لگایا جاتا ہے۔ جرح کر کے بعض باتیں ثابت کرائی جاتی

ہیں۔ اس دائی کے ساتھ میں نے اتنا وقت صرف کیا کہ رات آگئی۔ میں نے اُس کے لیے وہیں کھانا لانے کو کہا اور خود گھر چلا گیا۔ میں دماغ کو ذرا آرام دینا چاہتا تھا۔

میں نے جھوٹ بلوایا

میں واپس آیا تو دائی تر و تازہ ہو چکی تھی۔ اب مجھے اُس سے اپنا کام کروانا تھا۔ یہ تھا بختیار کو اس واردات میں لانا۔ وہ اس کی سزا سے صاف بچ رہا تھا۔ میرے ایمان کا تقاضہ تھا کہ اُسے پوری سزا ملے۔ اس مقصد کے لیے مجھے اُس کے خلاف شہادت گھڑنی تھی۔

"تم سیانی عورت معلوم ہوتی ہو"۔۔۔ میں نے دائی سے کہا۔۔۔ "تمہارا کیا خیال ہے، اس جرم کا اصل مجرم کون ہے؟"

"سچ پوچھئے تو سارا قصور راحیلہ کی ماں کا اور بختیار کا ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "زینو دیکھ رہی تھی کہ بختیار انوری سے ہٹ کر راحیلہ سے لگ گیا ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ بختیار کے اُس کی بیٹیوں کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں لیکن وہ بختیار سے قیمت وصول کرتی رہی۔ بدبخت بھوکی نظروں والی عورت ہے۔ آپ کو بتا چکی ہوں کہ اُس نے اپنی جوانی غیر مردوں کے ساتھ گزاری ہے.... اپنی بیٹیوں کو اِس راستے پر ڈالنے کی قصوروار یہی عورت ہے۔ دوسرا مجرم بختیار ہے جس نے راحیلہ کو اس حال تک پہنچایا اور اُسے تنہا چھوڑ دیا۔"

"مگر اُس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا"۔۔۔ میں نے کہا۔ "اُسے سزا نہیں مل سکتی۔ میں اُسے گرفتار بھی نہیں کر سکتا۔"

"اُسے خدا بخشے گا نہیں"۔۔۔ دائی نے کہا۔۔۔ "میں تو کہتی ہوں کہ خدا اُسے کوڑھی کر کے مارے۔"

"اگر تم میری مدد کرو تو میں اُسے سزا دلا سکتا ہوں"۔۔۔ میں نے

کہا۔۔۔ "تمہیں ایک جھوٹ بولنا پڑے گا۔"

"میں آپ کے حکم کی غلام ہوں"۔۔۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔۔۔ "آپ نے مجھ پر کرم کیا ہے۔ مجھے آپ جو کہیں گے وہ کروں گی۔"

"اپنے بیان میں یہ بھی شامل کر لو کہ جب راحیلہ نے بچے کو جنم دیا اُس وقت بختیار دوسرے کمرے میں موجود تھا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اور یہ کہنا کہ زینو بچے کو اٹھا کر بختیار کے پاس لے گئی تھی اور بختیار نے بچے کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ پھر یہ کہنا کہ بچے کی لاش تم اور بختیار نے لے جا کر دفن کی تھی۔ لاش تم نے اٹھائی تھی۔ رمبی سے گڑھا بختیار نے کھودا تھا۔"

دائی پوری طرح رضامند ہو گئی۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں زینو اور راحیلہ سے بھی یہی کہلواؤں گا۔ دائی کو میں نے پورا بیان یاد کرا دیا۔ اُس کا صرف یہ کہنا کافی نہیں تھا کہ بختیار بھی وہاں موجود تھا اور بچے کو اُس نے مارا اور دفن کیا ہے۔ مجھے عدالت میں یہ ثابت بھی کرنا تھا۔ میں نے دائی کو اپنی ضرورت کے مطابق بیان یاد کرا دیا۔

اُسے حوالات میں بند کر کے زینو کو اپنے دفتر میں لے آیا۔ اس عورت کو اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر مجھے غصّہ آ گیا لیکن میں نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔ اِس عمر میں بھی اِس عورت میں کشش تھی۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ زینو کے چہرے پر نیند اور پریشانی کے گہرے آثار اور آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اس کیفیت میں وہ اور زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔

"بچے کو کس نے قتل کیا تھا؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"وہ تو مُردہ پیدا ہُوا تھا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "میں صرف یہ مان لیتی ہوں کہ بچہ ناجائز تھا لیکن مُردہ پیدا ہُوا تھا۔ آپ کو دائی نے بتایا ہوگا۔ آپ نے سوچے سمجھے بغیر مجھے اپنی قید میں ڈال دیا ہے۔"

"میں اپنی قید سے تمہیں جلدی رہا کروں گا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "مگر یہاں سے رہا ہو کر تم گھر نہیں جیل میں جاؤ گی.... ساری عمر کے لئے۔"

تم بچے کی قاتل ہو۔ تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ دنیا کے قانون کی سزا تمہیں بعد میں ملے گی، خدا نے تمہیں سزا دے دی ہے .... تم بیوہ ہو چکی ہو۔ تمہارا خاوند اس بے عزتی کو برداشت نہیں کر سکا جو اُس کے لیے تم نے پیدا کی ہے۔"

"نہیں"۔۔۔ اُس نے گھبرا کر کہا۔۔۔ "ایسی بات نہ کہیں۔ اُنہیں کیا ہُوا ہے؟ وہ تو اچھے بھلے تھے۔"

"ایسے آدمی اچھے بھلے ہی نظر آیا کرتے ہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔ "تم جیسی بیویاں ان کے اندر اپنی کرتوت سے زہر بھرتی رہتی ہیں جو اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ اچانک گرتے اور مر جاتے ہیں.... تمہارا خاوند ہسپتال میں آتے ہی مر گیا تھا۔"

زینو کا سر جھک گیا، پھر اُس نے دوپٹہ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور وہ ہچکیاں لینے لگی۔

"اگر تمہارے دل میں اُس کی ذرا سی بھی محبت تھی تو تمہیں رونا نہیں چاہیئے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "وہ آزاد ہو گیا ہے۔ اگر زندہ رہتا تو کہاں منہ چھپاتا پھرتا۔ معزز آدمی اتنی ذلت کیسے برداشت کرتا۔ کیا یہ اچھا نہیں ہُوا کہ خدا نے اُسے اپنے پاس بلا لیا ہے؟"

وہ ہچکیاں لیتی رہی۔

"تم کیسے روتی ہو ذلیل عورت!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اُسے تم نے مارا ہے۔"

وہ چونک اٹھی اور فوراً سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ اس طرح گھبرائی ہوئی تھی جیسے اُسے اپنے گناہ اپنے سامنے ناچتے دکھائی دے رہے ہوں۔

"اب میں یہ جھوٹ نہیں سنوں گا کہ بچہ مُردہ پیدا ہُوا تھا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "دائی مجھے اصل کہانی سنا چکی ہے۔ اُس غریب عورت کو کیا ضرورت ہے کہ تمہاری پھانسی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈال لے؟"

میں نے اُس کی طرف جھک کر پوچھا۔۔۔ "کیا راحیلہ بھی چاہتی تھی کہ بچے کو مار دیا جائے؟ .... اب جھوٹ بولو۔"

"بھائی جی!"۔۔۔ اُس نے بھیک مانگنے کے لہجے میں کہا۔۔۔ "آپ جو خدمت کہیں گے کروں گی۔ وہ ناجائز بچہ تھا۔ اگر اسے دفن نہ کر دیتے تو ہماری کتنی بے عزتی ہوتی۔"

"مجھے بھائی نہ کہنا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "دوسری بات یہ ہے کہ ناجائز بچہ تم نے پیدا کرایا تھا۔ جب کوئی انسان، وہ بچہ ہو جوان ہو، بوڑھا ہو، قتل ہو جاتا ہے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ حلال کا تھا یا حرام کا۔ تم نے ایک انسان کو قتل کیا ہے .... میں تمہیں بحث اور جرح کی اجازت نہیں دوں گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ بچے کو تم نے قتل کیا تھا یا نہیں .... کہہ دو نہیں، پھر تماشہ دیکھنا۔"

"میں نے کہا تھا کہ کوئی خدمت بتائیں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "زیورات ہیں۔ نقد رقم ہے۔ جتنا کہیں گے دوں گی۔"

"مجھے سب سے پہلے تمہارا اقبالِ جرم چاہیئے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اپنے آپ صحیح اور پُورا بیان دے دو گی تو میں سزا میں رعایت دلا دوں گا۔ ایک بھی لفظ جھوٹ بولو گی تو عمر قید پاؤ گی"۔۔۔ اُسے خوش کرنے کے لیے کہا۔۔۔ "بالکل ہی بچا لینے کی صورت بھی پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔"

مجھے اس سے بھی کہلوانا تھا کہ بچے کو بختیار نے جان سے مارا اور اُس نے لاش دفن کی تھی لیکن میں اس عورت کو بھی سزا دلانا چاہتا تھا اس لیے میں نے اس کے ساتھ رویّہ نرم کر لیا۔ اسے اپنے خاوند کا بہت افسوس تھا۔ بیان کے دوران اس نے کئی بار اُس کا نام لیا اور وہ روئی۔ مجھے ایسی طیش آئی کہ میں بے قابو ہو چلا تھا لیکن مجھے اس عورت کو اعتماد میں لینا تھا۔ اپنے خاوند کی موت کا باعث وہ خود ہی تھی۔

یہ عورت جسے زینو کہتے تھے، کوئی عجیب و غریب کردار نہیں۔

ہمارے معاشرے میں اب بھی ایسی عورتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ ایک خاص قسم کے پاگل پن کی مریض ہوتی ہیں۔ عام الفاظ میں انہیں نفسیاتی مریض کہہ لیں۔ ایسی عورتیں ہمارے اپنے معاشرہ کی پیداوار ہیں اور معاشرہ ہی انہیں گناہگار کہتا اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

تفتیش کے لیے مجھے زینو کے بچپن کے حالات کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں نے اپنی دلچسپی کی خاطر اُس سے پوچھا تھا کہ اُس نے کس ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اُس نے اپنی گذری ہوئی زندگی کی پوری داستان سنا ڈالی جو میں نے دلچسپی سے سنی۔ پھر اُس نے اقبالِ جرم کیا۔

پیسوں کی صورت میں، پیار کی صورت میں

اُس کی بات تو بڑی ہی لمبی تھی۔ میں یہ اپنے الفاظ میں مختصر کر کے پیش کرتا ہوں۔

اُس کی عمر سات آٹھ سال کی تھی جب اُس کی ماں مر گئی۔ اُس کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ ماں کے مرنے کے ایک سال بعد وہ بھی مر گیا۔ زینو ہر وقت غموں تلے دبی رہتی تھی۔ بچپن کی شوخیاں اور کھیل کود ختم ہو گیا۔ اُس کے باپ کا چھوٹا بھائی بھی اسی حویلی میں رہتا تھا۔ دونوں بھائی شادی شدہ تھے۔ چھوٹے بھائی کی شادی کو تین سال ہو گئے تھے۔ ابھی بچہ پیدا ہونے کی کوئی نشانی نظر نہیں آئی تھی۔ زینو کی یہ چچی زندہ دل تھی۔

زینو کی ماں کے مرنے کے بعد زینو نے دیکھا کہ اُس کا باپ اپنے چھوٹے بھائی کی بیوی میں زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔ دونوں کا کاروبار اکٹھا تھا۔ کبھی ایک بھائی کو کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑتا کبھی دوسرے بھائی کو۔ زینو کا چچا مولوی قسم کا آدمی تھا۔ نماز روزے کی پابندی سختی سے کرتا تھا اور اُس نے داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اُس کی بیوی جس قدر زندہ دل تھی اتنا ہی وہ گھٹی ہوئی طبیعت کا تھا۔ وہ شاید ہنسنے اور مسکرانے کو غیر شرعی فعل سمجھتا تھا۔ وہ ابھی بھرپور جوانی کی عمر میں تھا۔

زینو کی ماں زندہ تھی تو اُس کا باپ کچھ اور تھا مگر زینو کی ماں مر گئی تو وہ اپنے چھوٹے بھائی کی بیوی کی طرح زندہ دل ہو گیا۔ اُس کا چھوٹا بھائی شہر سے باہر جاتا تو زینو کا باپ زیادہ تر وقت اُس کی بیوی کے ساتھ گزارتا۔

یہ جوان اور خوبصورت لڑکی زینو کے باپ کو دیکھ کر چمک اٹھتی تھی۔

ایک روز زینو کا باپ اپنے چھوٹے بھائی کی بیوی کے کمرے میں گیا۔ زینو اپنے برآمدے میں کھیل رہی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ جس کمرے میں اُس کا باپ چلا گیا تھا، وہ دروازہ بند ہو گیا۔ کچھ دیر بعد زینو اپنے باپ کے پاس جانے کے لیے اُدھر چلی گئی۔ دروازے کی ایک درز ذرا کھلی تھی۔ زینو نے اس درز میں سے اندر جھانکا۔ اُسے اپنا باپ اور چچی نیم برہنہ حالت میں دکھائی دیے۔ وہ واپس آ گئی۔ اُس کا باپ اور چچی تھوڑی دیر بعد باہر نکلے۔ باپ دکان پر چلا گیا۔

"چچی!" — زینو نے معصومیت سے چچی سے پوچھا — "ابّا جان اور آپ اندر ایک ہی چارپائی پر کیا کر رہے تھے؟"

"تم نے کیسے دیکھا تھا؟"

"دروازے کے ساتھ آنکھ لگا کر" — زینو نے جواب دیا۔

چچی نے اُسے ڈرانے دھمکانے کی بجائے اُسے بازوؤں میں لے کر پیار سے اپنے سینے سے لگا لیا اور اُس کے ساتھ خوب پیار کیا۔ اُسے دو پیسے دیے اور کہا کہ وہ اپنے چچا کے سامنے ایسی بات نہ کرے۔ زینو کو دو پیسوں کی نہیں پیار کی ضرورت تھی جو اُسے مل گیا۔ اُس نے پیار کے عوض چچی کا راز اپنے سینے میں دبا لیا۔ چچی نے اُس پر کبھی سختی نہ کی۔ اُسے کبھی ڈانٹا تک نہیں، بلکہ، زینو نے مجھے بتایا کہ چچی اس کے ساتھ اتنا پیار کرتی تھی کہ اُس کے دل سے ماں کا غم کم ہو گیا۔ باپ تو اُس کے ساتھ پیار کرتا ہی تھا۔

اس کے بعد اُس کا باپ اور چچی اُس کے سامنے الگ کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیتے۔ وہ مہینے میں دو یا تین بار ایسا کرتے تھے۔ زینو کو اتنا ہی احساس تھا کہ یہ پردے میں رکھنے والی بات ہے۔ زینو فخر محسوس کرتی تھی کہ وہ اپنے باپ اور چچی کا راز بے نقاب نہیں کرتی۔ اس کا اُسے انعام ملتا تھا جو پیسوں کی صورت میں بھی ہوتا تھا اور پیار کی

صورت میں بھی اور پھر اُسے کھلونے بھی ملنے لگے۔

زینو مجھے اپنے بچپن کی کہانی سنا رہی تھی۔ وہ چونکہ شریف عورت نہیں تھی اور شاید وہ مجھے خوش بھی کرنا چاہتی تھی، اس لیے وہ کوئی کوئی بات بڑی ننگی کر جاتی تھی۔ اس سے مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ یہ عورت جسمانی عیاشی اور لذّت کی شیدائی ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں اپنی دلچسپی کی خاطر اُس کے ماضی کو دیکھ رہا تھا۔ میں معلوم کر رہا تھا (اور آپ کو بتا رہا ہوں) کہ انسان کا کردار ماحول کے سانچے میں ڈھل کر بنتا ہے اور وہ اُن لوگوں کے نقشِ قدم پر چلتا ہے جن سے اُسے پیار ملتا ہے۔ کوئی انسان اپنے ماحول سے اور پیار کرنے والے انسانوں کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔

دلچسپی میری تو یہ تھی جو میں نے بتائی ہے لیکن رات بہت گزر گئی تھی۔ میں مسلسل تفتیش کر رہا تھا۔ تھکن سے میرا جسم دُکھنے لگا اور دماغ کمزور پڑ گیا تھا۔ آپ مجھے شریف آدمی نہیں کہیں گے لیکن میں آخر انسان ہوں اور وہ میری جوانی کی عمر تھی۔ زینو کی باتیں اتنی دلچسپ اور پُر لطف تھیں کہ میری جسمانی اور دماغی تھکن دُور ہونے لگی۔ اب بڑھاپے میں مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ وہ بے چاری اپنی کرتوت کی پیدا کی ہوئی مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی اور میں لطف اٹھا رہا تھا۔

اس سے مجھے یہ فائدہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ مجھے اپنا دوست سمجھنے لگی اور میری تفتیش کو اس سے بہت مدد ملی۔

مولوی کے گھر میں

زینو نے مجھے سنایا کہ اُس کی چچی نے پہلے بچے کو جنم دیا۔ یہ لڑکی تھی۔ زینو کا چچا خوش نہ ہُوا۔ وہ لڑکا چاہتا تھا۔ اس کے بعد زینو کے باپ اور چچی نے وہی سلسلہ شروع کر دیا اور چچا مذہب اور سادگی میں ڈوبا رہا۔ اب زینو کا باپ کاروبار کے سلسلے میں خود باہر نہیں جاتا تھا، بھائی کو بھیج دیتا تھا۔ وہ اور زینو کی چچی میاں بیوی لگتے تھے۔ وہ عملاً میاں بیوی ہی تھے۔ چچا باہر چلا جاتا اور زینو کا انہیں ڈر نہ تھا۔

اب زینو کو چچی کی بچی مل گئی تھی۔ اسے بھی وہ کھلونا سمجھتی تھی۔ اُس کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ اس سے چچی کو ایک نوکرانی جتنا فائدہ ہو گیا۔ اُس نے زینو کو اس کی بھی دل کھول کر اُجرت دی۔ زینو نے اپنے باپ اور چچی کے درپردہ تعلقات کو جائز سمجھ لیا تھا اور اُس کے ذہن میں یہ بھی بیٹھ گیا تھا کہ مرد اور عورت ایسے تعلقات قائم کرنے میں آزاد ہیں لیکن کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے۔

زینو تیرہ چودہ سال کی عمر میں ان تعلقات کی تفصیلات سمجھنے لگی تھی اور وہ اسی طرح ایک آدمی کی ضرورت محسوس کرنے لگی جس طرح اُس کی چچی کو اُس کا باپ مل گیا تھا۔ چونکہ وہ سب کچھ سمجھتی تھی اس لیے چچی اس کے ساتھ بڑی نازک باتیں کرنے لگی تھی۔ زینو اُس سے ایک بات پوچھتی تو چچی اُسے ایک بات فالتو بتا دیتی۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ زینو ذہنی طور پر قبل از وقت بالغ ہو گئی اور غلط خواہشات پیدا ہونے لگیں۔ سب سے پہلے جس نے اُس کی یہ خواہش پوری کی وہ ایک مولوی تھا۔ اُس وقت تک اُس

کی چچی کی ایک اور لڑکی پیدا ہو چکی تھی۔ زینو کا چچا پہلے ہی ایک لڑکی سے پریشان تھا، دوسری لڑکی پیدا ہو گئی۔ چچی اپنے خاوند کو ویسے ہی پسند نہیں کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ اُس نے خاوند کے ساتھ بول چال ہی بند کر دی۔

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ زینو میرے سامنے بیٹھی تھی اور وہ کس لہجے میں بول رہی تھی۔ وہ بولتے بولتے چُپ ہو گئی اور اُس نے سر جھکا لیا۔ میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ ایک دو منٹ بعد اُس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ بچپن میں ماں کے پیار کی محرومی اس خوبصورت عورت کو کہاں سے کہاں لے آئی ہے اور اس کا انجام کتنا بھیانک ہے۔ ذرا غور کریں کہ کتنے گناہگاروں نے مل کر اسے اس انجام تک پہنچایا تھا۔

"ایک اور بات ہے جو میں آپ کو نہیں سنانا چاہتی تھی"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "کوئی مسلمان میری اس بات کو سچ نہیں مانے گا۔ آپ بھی مسلمان ہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ بدمعاش عورت جھوٹ بول رہی ہے۔"

"میں نے تمہیں بدمعاش نہیں کہا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تمہاری ہر بات کو سچ مانوں گا۔"

"میری عمر ابھی دس سال تھی جب میرے چچا کی قسم کے ایک مولوی نے مجھے وہ راستہ دکھا دیا تھا جس پر میرا باپ اور میری چچی چل رہے تھے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "میں مسجد کے مولوی کے گھر سیپارہ پڑھنے جایا کرتی تھی۔ چھ لڑکیاں اور دو چھوٹے بچے بھی مولوی کے گھر پڑھا کرتے تھے۔ لڑکیاں مجھ سے چھوٹی بھی تھیں اور میری عمر کی بھی۔ مولوی سیپارے کے علاوہ ہمیں اردو بھی پڑھایا کرتا تھا۔ صرف میں تھی جسے خدا نے خوبصورتی اور رنگ بہت ہی اچھا دیا تھا....

"مولوی بوڑھا نہیں تھا اور وہ جوان بھی نہیں تھا۔ اُس کے تین بچے تھے اور بیوی بہت ہی موٹی اور کالے رنگ کی تھی۔ ایک بار مولوی

کی بیوی بچوں کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی۔ وہ دس بارہ دنوں بعد واپس آئی۔ ان دس بارہ دنوں میں مولوی نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مجھے دوسرے بچوں میں سے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے جاتا اور گود میں بٹھا لیتا اور بہت بُری حرکتیں کرتا۔ پیار بھی کرتا تھا۔ میں اپنے باپ اور چچی کو اکٹھے دیکھتی رہتی تھی اس لیے مولوی کی یہ حرکتیں مجھے بُری نہیں لگتی تھیں....

"مولوی نے جب دیکھا کہ میں خوش ہو رہی ہوں تو وہ بالکل ہی ننگا ہو گیا۔ میں تیرہ چودہ سال کی عمر تک مولوی کے گھر جاتی رہی۔ ایک روز مولوی کی بیوی نے مجھے گالیاں دے کر گھر سے نکال دیا۔ اُس روز مولوی کی بیوی نے ہمیں موقع پر پکڑ لیا تھا۔ بہت بعد میں جب میں پوری طرح جوان ہو گئی تو میرے دل سے خدا اور مذہب کا خوف نکل گیا۔ یہ خوف مولوی نے نکالا تھا۔"

ہو سکتا ہے آپ میں سے کچھ حضرات بُرا منائیں کہ میں نے اپنی کہانی میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مولوی جیسے معزز فرد کو بدنام کیا ہے، یا یہ کہ میں نے کفر بک دیا ہے لیکن جس واقعہ کو زینو عجیب و غریب سمجھتی تھی یا آپ اسے جھوٹ سمجھتے ہوں گے، یہ پولیس والوں کے لیے کوئی عجیب واقعہ نہیں بلکہ یہ گھناؤنا جُرم ہماری معاشرتی زندگی کے معمولات میں شامل ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو پاکستان کے کسی بھی جیل خانے میں چلے جائیں، آپ کو ایسے تین چار مولوی سزائیں بھگتتے ملیں گے جو اس گھناؤنے جرم کے مجرم ہیں۔ آپ اخباروں میں بھی ایسی خبریں پڑھتے ہوں گے۔

پھر سوتیلی ماں آ گئی

زینو کو مولوی کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔ زینو کے ذہن میں اُس کے باپ اور چچی نے یہی کچھ ڈالا تھا۔ بڑوں کا خوف نہ رہا۔ مذہب کا ڈر نہ رہا۔ کردار کی شکل جو باپ نے بنائی تھی وہ بنی۔ گناہ زمین کے نیچے جا کر کرو تو بھی چھپا نہیں رہ سکتا۔ انسانوں سے چھپ جائے تو خدا سے نہیں چھپایا جا سکتا۔ ایک رات مسجد میں عشاء کی نماز کے بعد عید میلاد النبیؐ کا جلسہ تھا۔ ایسے جلسے آدھی رات کے بعد ختم ہوا کرتے ہیں۔ زینو کا چچا یہ کہہ کر گیا کہ وہ جلسہ ختم ہونے پر آئے گا۔

زینو سو گئی۔ ایک شور سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس کی چچی اور چچا لڑ رہے تھے اور اُس کا باپ اپنے بھائی کے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ یہ واقعہ اس طرح ہوا کہ چچا جو کہہ گیا تھا کہ جلسہ ختم ہونے پر آئے گا، جلدی آ گیا۔ اُسے شاید کوئی تکلیف ہو گئی تھی۔ باہر کے دروازے کو زنجیر اس طرح لگائی گئی تھی کہ دونوں کواڑوں میں سے ہاتھ اندر کر کے کھولی جا سکتی تھی۔ یہ کچا انتظام اس لیے کیا گیا تھا کہ چچا کو دروازہ کھٹکھٹانا نہ پڑے اور گھر والے جاگ نہ جائیں۔ چچا نے زنجیر کھول لی۔ زینو کا باپ اور چچی بہت دلیر ہو چکے تھے۔ انہیں ایسا ڈر نہ تھا کہ زینو کا چچا جلدی آ جائے گا۔

وہ آ گیا اور سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ اُس نے زینو کے باپ اور اپنی بیوی کو موقعہ پر پکڑ لیا۔ لڑ جھگڑ کر اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ ابھی گھر سے نکل جاؤ اور دونوں بچیوں کو ساتھ لیتی جاؤ۔ زینو کا باپ اور چچی پہلے تو اُس کے آگے سر جھکائے کھڑے رہے، پھر انہوں نے منت سماجت کی

مگر وہ واہی تباہی بکتا چلا گیا۔ اُس کی بیوی نے آخر اُسے غصّے سے کوئی بات کہہ دی۔ چچا نے بیوی کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا۔ بیوی دیوار کے ساتھ جا لگی۔ زینو کے چچا نے اُسے پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بیوی سے کہتا تھا کہ فوراً اس گھر سے نکل جائے، ورنہ وہ اُسے قتل کر دے گا۔ بیوی کی زبان چل پڑی اور وہ گالیاں بکنے لگی۔ پڑوسی شور سن کر آ گئے۔

زینو کے چچا نے انہیں بتایا کہ اُس نے اپنی بیوی اور بڑے بھائی کو کس حالت میں پکڑا ہے۔

"یہ آدمی مجھے زہر لگتا ہے"— بیوی نے پڑوسیوں سے اپنے خاوند کے متعلق کہا — "یہ خاوند بننے کے قابل ہی نہیں۔ پہلے میرے ساتھ اس نے بولنا چھوڑ رکھا تھا۔ کہتا تھا کہ تم لڑکا پیدا نہیں کرتیں۔ اس شخص نے لڑکیوں کو قبول ہی نہیں کیا۔ اب میں اسے صاف بتاتی ہوں کہ یہ بچیاں اس کی ہیں ہی نہیں۔ یہ اس کے بھائی کی بچیاں ہیں۔"

زینو کی چچی غصّے سے پاگل ہو گئی تھی۔ جس خاوند کو وہ پسند نہیں کرتی تھی اُس نے اُسے مارا پیٹا تھا اور پھر گھر سے نکال رہا تھا۔ جب زینو کی چچی نے غصّے میں صاف بات کہہ دی تو اُس کے خاوند نے تین طلاق کا اعلان کر کے کہا کہ یہ بیوی اُس پر حرام ہے۔

مختصر یہ کہ زینو کے چچا نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اگلے روز چچی اپنی دونوں بچیوں کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ چچا نے زینو کے باپ سے کہا کہ اُسے کاروبار اور جائیداد کا نصف حصّہ دے دے اور وہ شہر سے ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا۔ بڑے بھائی نے اُس کا مطالبہ پورا کر دیا جس میں تین دن لگے۔ زینو کا چچا ایسا گیا کہ زینو نے اِس عمر تک اُسے نہ دیکھا۔

چار پانچ مہینوں بعد زینو کے باپ نے ایک بیوہ عورت کے ساتھ شادی کر لی۔ اِس عورت نے زینو کو بیٹی سمجھا ہی نہیں۔ اُسے وہ نوکرانی کی طرح استعمال کرنے لگی۔ زینو کے لئے پیار ختم ہو گیا۔ زینو پیار حاصل

کرنے کا طریقہ جانتی تھی۔ اُس نے پڑوسیوں کے ایک لڑکے کے ساتھ دل لگا لیا اور خوب بدکاری کی۔ پھر اُسے ایسا ایک اور مل گیا، پھر وہ بدنام ہو گئی۔ اُس کی سوتیلی ماں اور باپ کو اُس کی دوستیوں کا علم ہو گیا۔ اس کا یہی ایک علاج تھا کہ زینو کی شادی کر دی جاتی۔

زینو کا یہ خاوند جو مر گیا تھا، زینو کی سوتیلی ماں کا دُور پار کا رشتہ دار تھا۔ وہ اس قصبے کا رہنے والا تھا جہاں کی میں واردات سُنا رہا ہوں۔ اس کے ماں باپ کو اشارہ ملا تو فوراً زینو کا رشتہ مانگنے چل پڑے اور انہیں رشتہ دے دیا گیا۔

زینو نے مجھے بتایا کہ یہ شخص بالکل سیدھا اور بھلا مانس تھا۔ جوانی میں بھی اس میں جوانوں والا جوش و خروش نہ تھا۔ آدمی خوبصورت تھا۔ زینو کو یہ شخص پسند تھا لیکن وہ کچھ کمی سی محسوس کرتی تھی۔ میں اس تشنگی کو سمجھتا تھا۔ زینو اور اُس کی چچی کی قماش اور ذہنیت کی عورتوں کے لیے شریف اور بھلے مانس خاوند موزوں نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ایسے خاوند اچھے رہتے ہیں جو جانور ہوں اور بیویوں کو پیٹتے رہا کریں۔

زینو نے پَر پُرزے نکالے اور خاوند کو دھوکے دینے لگی۔ اُس نے دو تین درپردہ دوستیاں لگائیں۔ اُس میں کھانے پینے اور تھنے بڑنے کی علت بھی تھی۔ لوگ اُسے بدنام کرتے تھے لیکن اُس نے کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔ اُس پر ایک طرح کا پاگل پن سوار تھا جس میں وہ دوسروں کو پاگل سمجھتی تھی۔ اُس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اولاد بہت خوبصورت تھی۔ زینو نے لڑکوں کو بھی لڑکیاں بنا دیا۔

اُس کی لڑکیاں جوان اور وہ بوڑھی ہوتی گئی۔ جب لڑکیوں کے رشتوں کے پیغام آنے لگے تو زینو نے ہر امیدوار کو راضی رکھا اور ہر ایک سے کھاتی پیتی رہی۔ اُس کے خاوند کی یہ حالت تھی جیسے مر گیا ہو۔ بیوی کے آگے بالکل چُپ رہتا تھا۔ لڑکے بڑے ہوئے تو اُس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ دونوں لڑکیاں عزت اور شرافت میں رہیں لیکن زینو نے بختیار کو بڑی بیٹی

کے رشتے کا وعدہ دے کر اُس سے خوب کھایا اور بختیار نے جس طرح دونوں لڑکیوں کو خراب کیا وہ آپ سُن چکے ہیں۔

میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے زینو نے کہا کہ اُس نے وحیدہ کے خاوند حفیظ کو اپنی بڑی بیٹی انوری کے لیے پھانسا تھا اور ماں کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے انوری نے حفیظ کو پوری طرح اپنے جال میں لے لیا تھا مگر انوری کسی اور کے ساتھ چلی گئی۔

میرے ہاتھ میں بندوق ہو تو....

اُس نے نوزائیدہ بچے کے قتل کا اقبال جرم اسی طرح کیا جس طرح دائی مجھے بیان دے چکی تھی۔ اُسے توقع تھی کہ اب بختیار اس کی بیٹی راحیلہ کے ساتھ شادی کرلے گا مگر اُس نے ان کے گھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ زینو نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ راحیلہ بچے کو نہ مارنا چاہتی تھی نہ پھینکنا چاہتی تھی۔

مکمل بیان دے کر زینو نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میں اُس کے خلاف کارروائی نہ کروں اور کیس دبالوں۔ اُس نے مجھے منہ مانگی رشوت پیش کی۔ زیورات دینے کا بھی وعدہ کیا۔ میں اُسے بڑے اچھے طریقے سے ٹالتا رہا۔ میں نے بتایا ہے کہ مجھے ابھی اُس کے تعاون کی ضرورت تھی۔ اُس نے اپنی ذہنیت کے عین مطابق میرے لیے ایک اور کشش پیدا کردی۔

''راحیلہ کو ٹھیک ہو جانے دیں''— اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر رازداری سے کہا— ''جب آپ حکم کریں گے....''

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ چپ ہوگئی اور اُس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی تھی جسے میں سمجھتا تھا۔ میں نے ایسے محسوس کیا جیسے میرے دل سے درد اٹھا ہو۔ اس عورت کو اپنے باپ، اپنی چچی اور ایک مولوی نے اس راستے پر ڈالا تھا اور اس نے اپنی بیٹیوں کو اپنی فطرت کے سانچے میں ڈھال دیا اور جو نتائج پیدا ہوئے اُس کی سزا اس عورت کو اور اس کی بیٹی کو مل رہی تھی۔ دوسری بیٹی اچھی رہی جو اپنے کسی ایسے آشنا کے ساتھ نکل گئی جسے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

"زینو!" — میں نے اُس سے پوچھا — "اگر بختیار تمہارے سامنے آجائے تو اُس کے ساتھ کیا سلوک کروگی؟"

"میرے ہاتھ میں بندوق ہو تو اُس کے سر میں گولی ماروں" — اُس نے دانت پیس کر ایسے غصے سے کہا جس نے اُس کے آنسو نکال دیے۔ ذرا خاموش رہ کر اُس نے کہا — "لیکن اُسے تو آپ بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔"

"اگر میں اُسے پکڑ لوں تو تم ویسی گواہی دوگی جیسی میں کہوں گا؟"

"آپ جو کہیں گے میں کہہ دوں گی" — اُس نے جوشیلے لہجے میں کہا — "آپ بتائیں۔"

"تمہیں یہ بیان دینا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوا اُس وقت بختیار تمہارے گھر میں موجود تھا" — میں نے کہا — "بچہ پیدا ہُوا تو اُس نے کہا کہ بچے کو اِس کمرے میں لے آؤ۔ تم لے گئیں اور اُس نے بچے کا گلا گھونٹ دیا، پھر تم اور دائی لاش دفن کرنے گئیں۔ بختیار تمہارے ساتھ تھا۔ گڑھا اُس نے کھودا تھا اور لاش گڑھے میں ڈال کر اوپر مٹی ڈال دی تھی۔"

میں نے یہ بات بہت مختصر کی ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ کسی کے خلاف کوئی بات کہہ کر اُسے سزا دلائی جاسکتی ہے۔ عدالت میں صفائی کے وکیل جب جرح کرتے ہیں تو بڑے بڑے چالاک گواہوں کی زبان قلابازیاں کھانے لگتی ہے۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت سیشن اور دوسری کورٹوں میں صحیح معنوں میں بال کی کھال اُتاری جاتی تھی۔ لہٰذہ کسی کے خلاف سچّا الزام ثابت کرنا بھی محال ہوجاتا تھا۔ جھوٹا الزام صحیح ثابت کرنے کے لیے تو عقل اور تجربے کے پورے استعمال کی ضرورت ہوتی تھی۔ آج کل یہ کام آسان ہوگیا ہے۔ مجرموں کو بچالینا اور بیگناہوں کو پھنسالینا کوئی مشکل کام نہیں رہا۔

میں اچھی طرح بتا چکا ہوں کہ میں ایک ایسے گناہگار کو سزا دلانے کا تہیّہ کیے ہوئے تھا جسے قانون نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں شہادت اور ثبوت کا خاکہ تیار کرلیا۔ پہلا فیصلہ یہ کیا کہ دائی کو وعدہ معاف گواہ بناؤں گا۔ زینو کو میں نے بیان بتانا شروع کردیا۔ ساتھ یہ خیال بھی رکھا کہ زینو سزا سے بچ نہ سکے۔ اس کے جرائم آپ کو بتا چکا ہوں۔

زینو بار بار کہتی تھی کہ اُسے رہا کردوں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے خاوند کی میّت دیکھنا چاہتی ہے لیکن میں اُسے اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ دائی اور زینو کے لیے اچھی قسم کا ناشتہ لائے۔ زینو کو میں نے جھوٹے سچّے وعدوں سے بہلا کر حوالات میں بند کردیا۔

میں ایک روز پہلے کا تفتیش میں لگا ہُوا تھا۔ پوری رات جاگتے گزار دی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کیس کو ڈھیلا نہ چھوڑوں اور ختم کرلوں۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ میں تھوڑی سی دیر کے لیے سولوں اور وہ بختیار کو تھانے میں حاضر کرنے کا بندوبست کرے۔ میں نے اُسے گرفتار کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔

میں انگڑائیاں اور جمائیاں لیتا اپنے گھر کو چلنے ہی لگا تھا کہ تین آدمی تھانے کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کو میں پہچانتا تھا۔ وہ زینو کے محلّے کا ایک معزّز آدمی تھا۔ دوسرے دونوں چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔ وہ میرے پاس آئے۔ وہ ایک رپورٹ لے کے آئے تھے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ وہ میرے لیے ایک نئی مصیبت لے کے آئے تھے۔

ان دونوں میں ایک زینو کے خاوند کا بھائی تھا اور دوسرا چچازاد بھائی۔ انہوں نے رپورٹ یہ دی کہ اُن کے بھائی (زینو کے خاوند) کو زہر دیا گیا ہے۔ محلّے کے معزّز آدمی نے اس کی تائید کی۔ مرنے والے کے دونوں بھائیوں کو جو اس قصبے میں نہیں رہتے تھے، گذشتہ شام بھائی کے

مرنے کی اطلاع ملی تھی۔ وہ اپنی عورتوں کے ساتھ آدھی رات کے لگ بھگ پہنچے۔ یہاں انہوں نے ایک اور ہی ڈرامہ دیکھا۔ ان بھائیوں کو زینو کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"اس بدکار عورت نے ہمارے بھائی کو ہم سے جدا کر دیا تھا"۔۔۔ ایک بھائی نے کہا ۔۔۔ "ایک مدت سے ہمارا اِدھر آنا جانا بند تھا۔ اس گھر کی باتیں سنتے تھے تو شرم کے مارے اِدھر آنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ہمارے بھتیجوں پر مصیبت پڑی تو انہوں نے ایک آدمی بھیجا اور ہم آ گئے.... بھائی کی میّت رات کو دیکھی تو کچھ پتہ نہ چلا۔ صبح میّت کا چہرہ نیلا دیکھا اور منہ سے جھاگ پھوٹ رہی تھی۔ کپڑا ہٹا کر باقی جسم دیکھا۔ جسم بھی نیلا ہو گیا ہے۔ پرانی عمر کی عورتوں نے شور مچا دیا کہ اسے تو زہر دیا گیا ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ملک صاحب!"۔۔۔ محلّے کے معزّز آدمی نے کہا ۔۔۔ "میں لاش کی حالت دیکھ کر آ رہا ہوں۔ زہر کا اثر بڑا صاف ہے۔"

یہ لوگ درخواست لے کے آئے تھے کہ میں لاش کو اپنے قبضے میں لے کر پوسٹ مارٹم کراؤں۔

راحیلہ کی چیخیں

میری نیند اُڑ گئی۔ دماغ بیدار ہو گیا اور زینو پر مجھے اُس وقت جو غصّہ آیا، اگر قانون میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں زینو اور بختیار کو سامنے کھڑا کر کے ریوالور کی چھ کی چھ گولیاں اُن پر فائر کر دیتا۔ میں نے کسی سے پوچھے بغیر یقین کر لیا کہ زینو کے خاوند کو راحیلہ کے نوزائیدہ بچے کے قتل کے سلسلے میں زہر دیا گیا ہے۔

میں نے آرام کو ملتوی کر کے ضروری سٹاف ساتھ لیا اور زینو کے گھر جا پہنچا۔ اگر زینو مر جاتی تو اُس کی میّت پر اتنے لوگ نہ ہوتے جتنے اُس کے خاوند کی موت پر دیکھے۔ وہ شریف آدمی تھا۔ میں نے جاتے ہی میّت کا چہرہ دیکھا۔ اُس وقت تک میں زہر سے مارے ہوئے آدمیوں کی چند ایک لاشیں دیکھ چکا تھا۔ دیکھنے سے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ زہر سے مرے ہوئے آدمی کے جسم کا رنگ عجیب طرح کا نیلا ہو جاتا ہے۔ منہ سے جھاگ پھوٹ آتی ہے اور اگر زہر بہت تیز ہو تو جسم جگہ جگہ سے پھٹنے لگتا ہے۔

زینو کے خاوند کو بلاشک و شبہ زہر دیا گیا تھا۔

گھر میں زینو کے دو بیٹے رہ گئے تھے۔ غم سے اُن کی حالت بہت بُری تھی۔ میں باورچی خانے میں چلا گیا۔ وہاں کچھ برتن بغیر دُھلے پڑے تھے۔ یہ معلوم کرنا ناممکن تھا کہ مقتول کو کونسے برتن میں زہر دیا گیا ہے۔ پانی میں، دودھ میں، چائے میں، سالن میں۔ ظاہر ہے کہ اُسے الگ تھلگ کوئی زہر آلود چیز کھلائی یا پلائی گئی تھی۔

میں نے زینو کے بیٹوں کو الگ کر کے پوچھا کہ کل وہ اگر گھر میں تھے تو کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ان کی ماں نے ان کے باپ کو دودھ یا چائے یا پانی دیا تھا؟ —— نہیں — دونوں گھر میں تھے۔

"جب تمہاری بہن بچے کو جنم دے رہی تھی اُس وقت تم کہاں تھے؟"

"ہم گھر میں تھے" —— بڑے بھائی نے جواب دیا۔

"ہم سوئے ہوئے تھے" —— چھوٹے نے کہا —— "مجھے بڑی زور زور کی چیخیں سنائی دیں تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اِسے (بڑے بھائی) کو جگایا۔ جس کمرے سے چیخیں آ رہی تھیں، ہم دونوں اُس کے دروازے پر گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو ہماری ماں نے دروازہ کھول کر ہمیں کہا کہ جاؤ، دفع ہو جاؤ یہاں سے، راحیلہ کے پیٹ میں درد ہے۔ دائی اُس کا پیٹ مل رہی ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"کیا تمہاری بہن تین چار مہینوں سے اس کمرے میں بند تھی؟"

"ہاں جی" —— بڑے بھائی نے جواب دیا۔

"کیا وجہ تھی؟"

"اتنا تو ہم سمجھتے تھے کہ اُسے بچی بچہ ہونے والا تھا" —— بڑے نے جواب دیا —— "اور جب ماں نے ہمیں کہا کہ راحیلہ کے پیٹ میں درد ہے اور دائی کو بلایا ہے تو ہم سمجھ گیا کہ بچہ پیدا ہو رہا ہے۔ دائی تو دو تین گھنٹے پہلے آ گئی تھی۔"

"تمہارے باپ کو جب پتہ چلا تھا کہ راحیلہ اِس حالت میں ہے تو اُس نے کچھ کہا تھا؟"

"اُس بے چارے نے کیا کہنا تھا جی!" —— بڑے نے کہا —— "گھر میں ہماری ماں کا راج تھا۔ ہمارے باپ کا کام تھا پیسے کمانا اور ماں کا حکم تھا کہ دن بھر کی کمائی اُس کے حوالے کر دی جائے۔ وہ مسجد میں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔"

مجھے اِن دونوں لڑکوں پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ دونوں باپ پر نہ صرف بوجھ بنے ہوئے تھے بلکہ اُس کی بدنامی میں اضافہ کر رہے تھے لیکن میں انہیں کچھ نہیں کہہ رہا تھا کیونکہ انہیں اپنے ہاتھ میں رکھنا تھا۔ میں انہیں کہہ ہی کیا سکتا تھا۔ دو چار گالیاں دے دیتا۔ پھر کیا ہو جاتا؟.... کچھ بھی نہیں۔ مجھے یہ نقصان ہوتا کہ وہ مجھ سے بدکنے لگتے اور زبانیں بند کر لیتے۔ مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ زینو اور اُس کے خاوند کی آپس میں کوئی ایسی بات ہوئی ہو گی جس پر زینو نے اس شخص کو راستے سے ہٹا دینا ضروری سمجھا ہو گا۔

"بچے کی پیدائش کے وقت تمہارا باپ کہاں تھا؟"

"گھر میں ہی تھا" —— بڑے بھائی نے جواب دیا۔

"بہت پریشان ہو گا؟"

"ہاں جی!" —— بڑے بھائی نے جواب دیا۔

"شام کے وقت میں نے سنا تھا کہ ابّا جان امّی سے کہہ رہے تھے کہ تم مجھ سے طلاق لے لو اور میں اس گھر سے چلا جاؤں گا" —— چھوٹے نے کہا —— "میں نے بہت بدنامی برداشت کی ہے۔ تمہاری اس نئی کرتوت کو میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

"تمہاری ماں اُس کے گلے پڑ گئی ہو گی۔"

"نہ جی!" —— چھوٹے نے کہا —— "ماں بہت آہستہ بول رہی تھی۔ میں ساتھ والے کمرے میں تھا۔ وہ شاید ابّا جان کی منّت سماجت کر رہی تھی لیکن ابّا جان اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں تین چار معزّز مسلمانوں اور ہندوؤں کو ساتھ لے کر تھانے چلا جاؤں گا۔ میں ننگا تو ہو ہی چکا ہوں، تھانے جانے سے تھوڑی اور بدنامی ہو جائے گی.... اب ماں کو غصہ جھاڑنا چاہیئے تھا لیکن وہ اور زیادہ دھیمی آواز میں بولنے لگی۔ پھر ابّا جان باہر نکل گئے۔ ہماری ماں جب باہر آئی تو یہ کہتی ہوئی راحیلہ کے کمرے میں چلی گئی کہ میں اس شخص کا دماغ درست کر دوں گی۔"

زہر کا پیالہ

اس سے میرا یہ شک پختہ ہو گیا کہ اپنے خاوند کو زینو نے زہر دیا ہے۔ میں آپ کو وہ سارے سوال و جواب سنانا ضروری نہیں سمجھتا جو اِن لڑکوں کے ساتھ ہوتے۔ یہ بڑے ڈھیلے لڑکے تھے۔ غم کے مارے ہوئے بھی تھے اور اُن پر کوئی الزام نہ تھا۔ میں ان سے جو پوچھتا تھا وہ مکمل جواب دیتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کھانا ان لوگوں نے کس طرح کھایا تھا۔ کیا باپ کو الگ کھانا دیا گیا تھا؟ وغیرہ۔

اس اتنی لمبی پوچھ گچھ سے مجھے پتہ چلا کہ زینو کے خاوند نے اپنے بڑے بیٹے سے تین چار بار کہا تھا —— "اب تو میرے لیے یہی ایک راستہ رہ گیا ہے کہ کچھ کھا کر مر جاؤں" —— وہ بہت پریشان رہنے لگا تھا۔

"آپ جب ہماری ماں، دائی اور راحیلہ کو گرفتار کرنے آئے تھے تو اس سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے ابّا جان دکان سے گھر آئے" —— بڑے بھائی نے بتایا —— "میں گھر میں تھا۔ ابّا جان نے مجھے کہا —'پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ پولیس کو پتہ چل گیا ہے کہ بچہ کس گھر میں پیدا ہُوا تھا۔ اب پولیس یہاں آئے گی' — ابّا جان کی آواز کانپ رہی تھی۔ انہوں نے کہا — 'کچھ سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔ جی میں آتی ہے کہ تمہاری ماں کو قتل کر کے تھانے چلا جاؤں'....

"میں نے ابّا جان سے کہا کہ میں امّی سے کہتا ہوں کہ اپنے بچاؤ کا انتظام کرے۔ ابّا جان نے کہا — 'وہ بدبخت بدکار اب کیا انتظام کرے گی' — میں کمرے سے نکلنے لگا تو ابّا جان نے مجھے کہا کہ پانی پلاؤ۔ میں نے

انہیں گلاس میں پانی دیا اور کمرے سے نکل آیا۔ میں ماں کو خبردار کرنے گیا تھا۔ وہ راحیلہ کے کمرے میں تھی۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے ماں کے ڈر سے دروازے پر دستک نہ دی۔ میرا چھوٹا بھائی گھر میں ہی تھا۔ میں ابّا جان کے کمرے میں گیا تو وہ پانی پی چکے تھے۔ انہوں نے بُرا سا منہ بنا رکھا تھا۔ مجھے شک ہُوا کہ ابّا جان نے پانی میں کچھ پی لیا ہے۔ گلاس چھوٹی میز پر پڑا تھا اور اس کے قریب کاغذ کا ایک پُرزہ پڑا تھا۔ ابّا جان پلنگ پر بیٹھے تھے....

"میں اُن سے پوچھنے لگا تھا کہ انہوں نے کچھ پی تو نہیں لیا لیکن دروازے پر کسی نے بڑی زور سے ہاتھ مارا اور مجھے کسی کے اندر آنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ابّا جان نے کہا —'یہ ضرور پولیس ہوگی' — پھر آپ آ گئے اور آپ کے سامنے جا کر ابّا جان گر پڑے۔ اس کے بعد گھر میں ایسی قیامت آئی کہ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ ابّا جان نے پانی پیا تھا۔ وہ ہسپتال جا کے مر گئے تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اب آپ نے بات کی ہے تو مجھے خیال آیا ہے کہ ابّا جان نے مجھے چند مرتبہ کہا تھا کہ وہ کبھی کچھ کھا کر مر جائیں گے۔"

یہ کل کا واقعہ تھا۔ میں نے اس لڑکے سے کہا کہ مجھے اُس کمرے میں لے چلو جس میں تمہارے باپ نے پانی پیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ گلاس ابھی وہیں پڑا ہوگا۔ اس گھر میں برتن سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے محلّے کے دو آدمیوں کو گلاس کی برآمدگی کے گواہوں کے طور پر ساتھ لے لیا۔

ہم اُس کمرے میں گئے تو زینو کے خاوند کا سگا بھائی اور چچازاد بھائی ساتھ تھے۔ ایک گلاس پلنگ کے پاس رکھی ہوئی چھوٹی سی میز پر پڑا تھا۔ اس کے ساتھ کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی پڑا تھا جسے دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ کاغذ پہلے پُڑیا کی شکل کا تھا۔ میز پر ایک پنسل بھی پڑی تھی جس کا رنگ کھایا ہُوا تھا۔ مرنے والے نے دو گھونٹ پانی چھوڑ دیا تھا۔ پانی کا رنگ ذرا بدلا ہُوا تھا۔ میں نے کاغذ کے ٹکڑے کو غور سے دیکھا۔

بے رنگ سا پاؤڈر اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

پنسل کو میں نے نظر انداز نہ کیا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرے دماغ نے مجھے کہا کہ مرنے والے نے پانی میں پڑیا سے زہر انڈیلا اور اسے پانی میں حل کرنے کے لیے پنسل سے چمچ کا کام لیا۔

میں نے مرنے والے کے بڑے بیٹے کا بیان گواہوں اور مرنے والے کے دونوں بھائیوں کے سامنے لکھا اور گلاس کی نشاندہی کرائی کہ اس کے باپ نے اس گلاس سے پانی پیا تھا۔ میں نے اس کے اور گواہوں کے دستخط لے کر گلاس بمعہ پانی، کاغذ کا ٹکڑا اور پنسل اپنے قبضے میں لے لیے۔

مرنے والے کے بھائیوں نے مجھے کہا کہ اس لڑکے نے اپنی ماں کو بچانے کے لیے یہ بیان دیا ہے کہ اس کے باپ نے خود زہر پیا ہے۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں صرف اسی ایک بیان پر کیس داخل دفتر نہیں کروں گا، میں پوری تفتیش کروں گا۔

میں نے شرافت سے بات کی تھی۔ اُن کا بھائی مر گیا تھا۔ میں ان پر رعب جھاڑنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرنے والے کے سگے بھائی نے مجھے کوئی کمزور سا تھانیدار سمجھ لیا۔

"آپ تفتیش نہیں کریں گے تو ہم اوپر درخواست دے دیں گے" — اُس نے کہا — "یہ گھر تو چکلہ بنا رہا ہے۔ تھانے میں انہی لوگوں کی شنوائی ہوتی ہے۔ ہمارا بھائی تو اللہ میاں کی گائے تھی۔"

میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرم سے لہجے میں کہا —

"بھائی میرے! تم نے اُس وقت بھائی کی کیا مدد کی تھی جب وہ اس چکلے میں اللہ کی گائے بنا ہوا تھا۔ وہ بیوی کو طلاق دینا چاہتا تھا لیکن بیوی کا تعلق بدمعاشوں کے ساتھ تھا۔ تم اپنے بھائی کو اس بدمعاش عورت سے آزاد کرانے کبھی آتے تھے؟ تم اپنی بھتیجیوں کی کرتوت ضرور سنتے رہتے ہو گے۔ اُس وقت تمہاری غیرت کہاں تھی؟"

وہ منہ کھول کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"آج تم اپنے مرے ہوئے بھائی کی جائیداد پر قابض ہونے کے لیے آ گئے ہو؟" — میں نے کہا — "اور کہتے ہو کہ تھانے میں چکلے والوں کی شنوائی ہوتی ہے؟ تمہاری بڑی بھتیجی کسی کے ساتھ نکل گئی ہے۔ اپنے بھائی کی خاطر کبھی اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے؟ یہاں آ کر تم نے اپنے بھائی کا حال پوچھا تھا؟"

مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اندر سے کانپ رہا ہو۔

"تم اپنے بیٹوں کے ہاتھوں قتل ہوگی"

میں نے لاش اٹھوائی۔ گلاس، کاغذ کا ٹکڑا اور پنسل لے کر ہسپتال چلا گیا۔ ڈاکٹر نے لاش دیکھتے ہی کہہ دیا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ وہ جب مر گیا تھا تو لاش میں زہر کے کوئی آثار نہیں تھے اس لیے ڈاکٹر نے لاش مرنے والے کے بیٹوں کے حوالے کر دی تھی۔ یہ آثار گھر جا کر ظاہر ہوئے تھے۔ اب ڈاکٹر کو لاش کا پوسٹ مارٹم کرنا تھا اور معدے کے اجزا ماہرین کے پاس بھیجنے تھے۔ گلاس، پانی، کاغذ کے ٹکڑے اور پنسل کو بھی وہیں جانا تھا۔ یہ معائنہ قصبے کا ڈاکٹر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے انتظام کر دیا کہ یہ اشیاء ایک ہیڈ کانسٹیبل دستی لے جا کر رپورٹ لے آئے تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔

میں نے اس شک کو بھی سامنے رکھا ہوا تھا کہ زینو کے بڑے بیٹے نے یہ بیان دے کر اپنی ماں کو بچانے کی کوشش کی ہوگی۔ میں نے دونوں بھائیوں کو پہلے ہی تھانے بھجوا دیا تھا۔ بڑے بھائی کو میں نے اپنے دفتر میں بٹھا لیا اور اُس نے جو بیان دیا تھا اسے سامنے رکھ کر اس پر جرح کرنے لگا۔ اُس سے معلوم کیا کہ جب اُس کے باپ نے اُس سے پانی مانگا تھا اُس وقت اُس کی ماں اور دائی کہاں تھیں۔ کچھ اور باتیں معلوم کیں۔ مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ یہ لڑکا جھوٹ نہیں بول رہا۔ اُس کی باتوں سے میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اُس کے دل میں ماں کی محبت نہیں حقارت تھی۔

"اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہو جاتا کہ میرے ابّا جان کو میری امّی نے زہر دیا ہے تو خدا کی قسم میں اُسے قتل کر دیتا"۔۔۔ اُس نے کہا۔

"کیا تم میں کسی کو قتل کرنے کی ہمت ہے؟"

"شاید ہمت آجاتی"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"تم دونوں بھائیوں میں ذرا سی بھی غیرت ہوتی تو آج تمہارا گھر اس طرح نہ اُجڑتا"۔۔۔ میں نے کہا۔

اُس نے سر جھکا لیا۔ میں نے اُسے اور کچھ نہ کہا۔ اُسے باہر بھیج کر اُس کے چھوٹے بھائی کو بلایا۔ وہ اپنی بہن راحیلہ کی تصویر تھا۔ خوبصورت بھی راحیلہ جیسا ہی تھا۔ میں نے اُس سے بھی پوچھ گچھ کی۔ وہ شرمائی ہوئی لڑکیوں کی طرح بات کرتا تھا۔ اس سے میں نے جو کچھ کہلوایا اس سے اُس کے بھائی کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی۔

مجھے آج تک یاد ہے کہ بھوک سے میرا حال بہت بُرا ہو رہا تھا لیکن میں نے زہر خورانی کی اس واردات کی تفتیش فوراً ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس لڑکے کو میں نے باہر بھیج دیا اور ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ زینو کو حوالات سے نکال لائے۔ چند منٹ بعد مجھے برآمدے میں شور سنائی دیا۔ کوئی ہنگامہ ہو رہا تھا۔ میں دوڑ کر باہر نکلا۔

برآمدے میں دیکھا کہ کسی نے کسی کو نیچے گرا رکھا تھا اور بہت سے کانسٹیبل اوپر والے کو اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لڑنے والے کانسٹیبلوں میں مجھے نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے گرج کر کہا۔۔۔ "چھوڑ دو انہیں۔ میں دیکھتا ہوں یہ کون ہیں"۔

سب پیچھے ہٹ گئے۔ اوپر زینو کا بڑا بیٹا تھا۔ نیچے زینو تھی۔ بیٹا اپنی ماں کے پیٹ پر بیٹھا تھا اور اُس نے اپنی ماں کی گردن اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں لے رکھی تھی۔ ماں کی آنکھیں باہر آ رہی تھیں۔ میں نے یہ منظر صرف تین چار سیکنڈ دیکھا۔ میں دوڑ کر پہنچا اور بیٹے کی کلائیوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کلائیاں مروڑیں تو اُس کے ہاتھ ماں کی گردن سے ہٹ گئے۔ وہ لڑکیوں جیسا لڑکا میری جسمانی طاقت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پھر ماں کی گردن دبوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اُس کے سر کے

بالوں کو مٹھی میں لے کر زور سے اوپر کو جھٹکا دیا تو وہ اوپر کو اٹھ آیا۔

"اِسے قتل کر لینے دیں پھر مجھے گرفتار کر لینا"۔۔۔ بیٹے نے کہا۔۔۔

"طوائف نے ہمارا بیڑہ غرق کر دیا ہے"۔

مجھے بتایا گیا کہ زینو کو حوالات سے نکال کر میرے پاس لا رہے تھے۔ اُس کے بڑے بیٹے نے سامنے آ کر اُس کے پیٹ میں گھونسہ پھر اُس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ زینو پیٹ پر ہاتھ رکھ کر گھٹنوں کے بل فرش پر گری۔ بیٹے نے اُسے پیٹھ کے بل گرا دیا اور اُس کے پیٹھ پر بیٹھ کر اُس کی گردن اپنے ہاتھوں میں جکڑ لی۔

میں بیٹے کو اپنے دفتر میں لے گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اُس پر تھانیداروں والا غصہ نہ جھاڑا، بلکہ شفقت کے ذریعے اُسے ٹھنڈا کیا اور اُسے کہا کہ اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر وہ ہسپتال چلا جائے اور اپنے باپ کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد لے جائے۔ دونوں بھائی تھانے سے نکل گئے تو زینو کو میرے پاس لائے۔ اُس کی حالت بگڑی ہوئی تھی اور اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

"ایسے ہونا ہی تھا زینو!"۔۔۔ میں نے کہا اور اُسے بٹھا کر اُس کے لئے پانی منگوایا۔۔۔ "میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ آج تم اپنے بیٹے کے ہاتھ سے بچ گئی ہو لیکن تم اپنے بیٹوں کے ہاتھوں قتل ہو گی"۔

اُس نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے اور چُپ رہی۔

"اپنے خاوند کو اگر تم نے زہر دیا ہے تو بتا دو"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "میں وعدہ کرتا ہوں...."

"زہر؟"۔۔۔ اُس نے حیرت سے کہا۔۔۔ "اپنے خاوند کو؟"

"ہاں زینو!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تمہارا خاوند زہر سے مرا ہے"۔

"نہیں۔ نہیں"۔۔۔ اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھئے، آپ نے مجھ سے جو پوچھا وہ میں نے سچ سچ بتا دیا۔ اب مجھ پر جھوٹا الزام نہ لگائیں"۔

میں نے اُس کے بڑے بیٹے کے بیان کو ذہن میں رکھ کر اُس پر جرح شروع کر دی مگر اُس کے بیٹے کا بیان صحیح نکلا۔

پھر میں نے دائی کو بلوایا۔ اُس نے بھی تصدیق کر دی کہ زینو نے اپنے خاوند کو زہر نہیں دیا۔

"زہر دینے کی ضرورت ہی کیا تھی"۔۔۔ دائی نے کہا۔۔۔ "خاوند تو زینو کے انگوٹھے کے نیچے تھا"۔

مختصر یہ کہ شام تک میں نے پوچھ گچھ میں جو مغز کھپائی کی، اس سے یہی تصدیق ہوئی کہ زینو کے خاوند کو کسی اور نے زہر نہیں دیا۔ اُس نے خود ہی پیا ہو گا۔

جب گناہ سامنے آئے

مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ بختیار تھانے میں آیا بیٹھا ہے، یہ بھی پتہ چلا کہ اُس کا بڑا بھائی بھی ساتھ ہے۔ میں نے کہا کہ انہیں بٹھائے رکھو۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں گھر چلا گیا۔ نہا کر کھانا کھایا اور لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں تھانے میں کہہ آیا تھا کہ رات کو میں کسی بھی وقت آجاؤں گا۔

تھانے جا کر بختیار کو بلوایا۔ وہ کانسٹیبلوں کی بارک سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک ٹانگ ذرا گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ میں نے زیادہ توجہ نہ دی۔ اُسے دیکھ کر مجھے غصہ آگیا۔ آدمی تو خوبرو تھا لیکن اُس کا چہرہ مجھے منحوس اور مکروہ لگا۔ اُس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے سلام کیا۔ میں اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔ بختیار اندر آیا۔ میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو آواز دی۔ وہ دوڑا آیا۔

"اسے حوالات میں بند کر دو"— میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اُسے بازو سے پکڑا تو وہ میری طرف آنے لگا۔

"حوالات میں مجھے کیوں بند کرا رہے ہیں ملک صاحب؟"— بختیار نے کہا — "میں نے کونسا جرم کیا ہے؟"

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو سر سے ہلکا سا اشارہ کیا کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں بختیار کو نوزائیدہ بچے کے قتل میں پھانس رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکالنا ضروری تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ اُس کا جرم کیا ہے۔

"کوئی ایک جرم ہو تو تمہیں بتاؤں"— میں نے بختیار سے کہا — "تم تو پکے پاپی ہو۔ آج رات تمہارے سارے گناہ تمہارے سامنے آئیں گے۔"

"جناب ملک صاحب!"— اُس نے ہڑبڑاتے ہوئے کہا — "حوالات میں بند کرنے سے پہلے مجھے کچھ کہنے کا موقع دیں۔ میں آپ کے سارے شک رفع کر دوں گا۔"

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو باہر بھیج دیا اور بختیار کو سامنے بٹھا لیا۔

"آپ کہتے ہیں کہ کوئی ایک جرم ہو تو بتاؤں"— اُس نے کہا — "جناب! مجھے پتہ چل چکا ہے کہ راحیلہ اور اُس کی ماں نوزائیدہ بچے کو مار کر باہر پھینکنے کے جرم میں پکڑی گئی ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ وہ میرا بچہ ہے مگر تین ماہ سے اوپر عرصہ ہو گیا ہے، میں اُن کے گھر نہیں گیا، نہ مجھے یہ علم تھا کہ بچہ پیدا ہوا ہے۔ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو انہیں بچے کو قتل نہ کرنے دیتا۔"

وہ تیز تیز بول رہا تھا اور میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بالکل خاموش تھا۔ وہ مجھ سے نظریں ملانے سے گھبرا رہا تھا۔ اُس کی زبان ہکلانے لگی۔ اُسے توقع تھی کہ میں اُس سے کچھ پوچھوں گا اور اُسے جھٹلاؤں گا اور وہ اپنی صفائی میں کچھ اور کہے گا لیکن میں بالکل چُپ تھا۔

"خدا کی قسم!"— اُس نے اُکھڑے ہوئے لہجے میں کہا — "میری ٹانگ پر میرے بڑے بھائی نے چاقو مارا تھا۔ وہ باہر بیٹھا ہے۔ اُس سے پوچھ لیں۔ میرا چھوٹا بھائی گھر میں ہے۔ اُسے بلا کر پوچھ لیں۔"

میں حیران ہونے لگا کہ یہ ٹانگ اور چاقو کا کیا قصّہ لے بیٹھا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ میرے آگے مظلوم بننے کی کوشش کر رہا ہے کہ اُدھر اُس کے بھائی نے چاقو مارا ہے اِدھر میں اسے غلط الزام میں حوالات میں بند کر رہا ہوں۔

"کیا تم اپنے بھائی کے خلاف پرچہ کرانا چاہتے ہو کہ اُس نے تمہیں

چاقو مارا ہے؟"—— میں نے پوچھا اور کہا —"لیکن پرچہ کرا دینے سے تمہارے جرم بخشے تو نہیں جائیں گے۔ ان کا حساب کتاب تو تمہیں دینا ہی پڑے گا۔"

میرے پاس مشتبہ اور ملزم آکر اس سے زیادہ بوکھلایا کرتے تھے لیکن بختیار کی بوکھلاہٹ اور ہکلاہٹ کچھ اور ہی قسم کی تھی۔ اُس کے منہ سے جب کئی بار "میری ٹانگ، چاقو، میری ٹانگ، چاقو" کے الفاظ نکلے تو میرا دھیان اُس واردات کی طرف چلا گیا جس میں ملنگوں کے ساتھی پر کسی نے رات کو کلہاڑی سے حملہ کیا تھا اور اُس نے حملہ آور کی ٹانگ میں چاقو اتار دیا تھا۔ اس واردات کو ابھی ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا۔ مضروب ہسپتال میں تھا اور ملنگ میرے سر پر سوار رہتے تھے کہ میں ملزم کو جلدی پکڑوں۔

مجھے خیال آیا، کیا ایسے ہو سکتا ہے کہ بختیار نے اُس پر حملہ کیا ہو؟ کیا نہیں ہو سکتا۔ بختیار شریف آدمی نہیں تھا۔ اچھا بھلا بدمعاش تھا۔ تکئے پر جُوا کھیلنے جاتا ہوگا، یا کسی اور بدمعاشی کے سلسلے میں اُس کی مضروب کے ساتھ دشمنی ہو گی۔

مجھے اچانک انوری کا خیال آگیا۔ وہ لاپتہ تھی۔ یہ ممکن تھا کہ اُسے بختیار نے غائب کرایا ہو، یا انوری خود ہی اُس کے گلے پڑ گئی ہو۔ انوری کی ماں اس پر تو زور دے رہی تھی کہ وہ دونوں بہنوں میں سے کسی کے ساتھ شادی کر لے لیکن وہ انہیں ٹرخا گیا تھا۔ انوری اُس کے پاس چلی گئی ہو گی اور اُس نے انوری کو کہیں اور رکھا ہوگا اور اس سلسلے میں لڑائی جھگڑا ہُوا ہو گا۔

یہ سب میری قیاس آرائی تھی۔ مشکل یہ ہوتی ہے کہ سیدھا سوال کر دو تو اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ پھر ملزم اسی نفی پر ہی قائم رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

آپ شاید حیران ہوں گے کہ بختیار اتنا کچا تھا کہ اُس نے خود ہی اپنا ایک جرم اُگل دیا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ بدمعاشی اور جرم کرنا ایک بات ہے لیکن جب کسی کی بدمعاشی تھانے کے احاطے میں آجاتی ہے تو یہ بات بہت ہی مختلف ہو جاتی ہے۔ تھانے میں تھانیدار کے سامنے بیٹھ کر بڑے

بڑے بدمعاشوں کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ پولیس، حوالات اور سزا کے خوف کے علاوہ گناہ میں لذّت تو ہے لیکن اس میں ایک اور قوت بھی پوشیدہ ہے۔ یہ قوت جب گناہگار کے سامنے آجاتی ہے تو گناہگار اپنے گناہ یوں اُگل دیتا ہے جس طرح کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو سامان دریا میں پھینکنا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض ایسے گناہ بھی آجاتے ہیں جو ملزم نہیں اُگلنا چاہتا—— یہ حال بختیار کا ہو رہا تھا۔

شلوار اوپر کر دی

میں نے بچ بچ کر پوچھ گچھ شروع کر دی۔

"تمہارا بھائی بہت بیوقوف آدمی ہے"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "اپنے چھوٹے بھائی کو چاقو مار دیا.... اُس نے چاقو کیوں مارا ہے؟"

"کہتا تھا کہ زینو سے تعلق توڑ تو"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "میں نے اُسے بتایا کہ میں تو بہت عرصے سے اُس کے گھر نہیں گیا۔ اُس نے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور اپنی آمدنی زینو اور اُس کی بیٹیوں کو کھلا رہے ہو۔ میں نے اُسے یقین کرانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مان رہا تھا۔ اس پر ہماری لڑائی ہو گئی اور میرے بھائی نے مجھے چاقو مار دیا۔"

میں نے اُس کے ساتھ دِلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس سے اُس کی زبان میں روانی آ گئی۔ اُس کا اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ میں نے اُس پر بچے کے قتل کا الزام عائد کیا تھا۔

"ملک صاحب!"۔۔۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر منّت کی ۔۔۔ "میری بات مان جائیں۔ میں نے بچے کو قتل نہیں کیا۔ میرے سر پر قرآن پاک رکھ دو۔ میں کہوں گا کہ میں وہاں تھا ہی نہیں اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ آج بچہ پیدا ہُوا ہے۔"

"مان لوں گا یار!"۔۔۔ میں نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا ۔۔۔ "مان لوں گا۔ مجھے تمہارے بھائی پر غصہ آ رہا ہے جس نے تمہیں چاقو مارا ہے.... زخم کیسا ہے؟ گہرا ہے؟"

"اسے جانے دیں ملک صاحب!"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "معمولی سا زخم ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

اُس نے تین چار روز پہلے کا ایک دن اور وقت دن کا بتایا۔ میں نے اُسے کہا کہ شلوار اوپر کر کے مجھے زخم دکھائے۔ وہ پس و پیش کرنے لگا۔ میں نے اُس کی شلوار زخمی ٹانگ سے اوپر کر دی۔ پٹی کسی ڈسپنسر کی بندھی ہوئی تھی اور پٹی نے خاصی جگہ گھیری ہوئی تھی۔ کوئی اناڑی آدمی اس طرح پٹی نہیں باندھ سکتا۔ پٹی کی لمبائی چوڑائی سے پتہ چلتا تھا کہ زخم گہرا بھی ہے اور چوڑا بھی۔

"پٹی کس سے کروائی تھی؟"

اُس نے ایک ہندو ڈسپنسر کا نام لیا۔ بازار میں اس ڈسپنسر کی اپنی دکان تھی۔ مرہم پٹی کرتا اور چھوٹی چھوٹی بیماریوں کی دوائیاں دیتا تھا۔

میں نے بختیار سے بہت ساری باتیں پوچھیں۔ وہ گھبرانے لگا۔ میں نے یہ بھی پوچھ لیا کہ جب اُسے چاقو مارا گیا اُس وقت اُس نے پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ میں کسی شک پر اُس سے زخم کے متعلق اتنی زیادہ باتیں پوچھ رہا ہوں۔ میں نے اُس کے چہرے پر بڑی صاف تبدیلیاں دیکھیں۔

میں نے آگے ہو کر رازدارانہ لہجے میں کہا ۔۔۔ "بختیار سچ بتا دو انوری کہاں ہے؟"

وہ تڑپنے لگا۔ معلوم نہیں کیا کہنا چاہتا تھا کہ اُس کی زبان بکلانے لگی۔

"پہلے آپ نے کہا ہے کہ میں نے بچے کو قتل کیا ہے"۔۔۔ اُس نے روتی ہوئی آواز میں کہا ۔۔۔ "اب آپ مجھ سے پوچھتے ہیں انوری کہاں ہے؟"

میں نے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور بختیار سے کہا ۔۔۔ "باہر جا کر بیٹھو اور سوچو۔ اچھی طرح سوچ لو گے تو میں تمہارے ساتھ بات کروں گا"۔۔۔ کانسٹیبل سے کہا کہ اسے باہر لے جا کر اپنے ساتھ رکھے اور اس کے بھائی کو اندر بھیج دے .... دو چار منٹ بعد وہ آ گیا۔ یہ وہی پہلوان نما آدمی تھا جس نے مجھے بڑے رعب سے کہا تھا کہ اُسے پتہ چل جائے کہ بختیار پر کس نے حملہ کیا ہے تو وہ اُس

آدمی کی لاش میرے پاس لے آئے گا۔ اس شخص نے مجھ پر بھی رعب جمانے کی کوشش کی تھی۔ وہ بات پرانی ہوگئی تھی۔ اب پھر یہ شخص میرے سامنے بیٹھا تھا۔

"کیوں پہلوان!"— میں نے اُس سے پوچھا — "اپنے بھائی کو چاقو کیوں مارا ہے؟"

"ایک عرض کرتا ہوں جناب!"— اُس نے کہا — "کیا آپ مجھ پر کیس بنائیں گے؟.... میں نے بھائی کو ڈرانے کے لیے چاقو گھمایا تو اُسے لگ گیا۔"

میں نے بناوٹی سی ہنسی ہنس کر کہا — "ویسے ہی پوچھ رہا ہوں بھائی! تمہارے بھائی نے تمہارے خلاف رپورٹ تو نہیں کی.... یہ کب کا واقعہ ہے؟"

اُس نے وہی دن بتایا جو بختیار نے بتایا تھا لیکن وقت جو بتایا وہ اُس سے مختلف تھا جو بختیار نے بتایا تھا۔ میں نے اُس سے لڑائی کی وجہ پوچھی تو اُس نے وہی وجہ بتائی جو بختیار نے بتائی تھی۔

"زخم گہرا ہے یا معمولی سا ہے؟"

"معمولی سا ہے جی!"— اُس نے کہا — "آپ اس معاملے کو اتنا کیوں کرید رہے ہیں جناب؟"

"میں جو پوچھتا ہوں اُس کا جواب دو"— میں نے کہا — "ابھی بتا دوں گا کہ میں اس معاملے کو کیوں کرید رہا ہوں"— میں نے جھوٹ سچ الگ کرنے کے لیے اُسے چکر دیا — "زخم معمولی ہی ہوگا، اسی لیے مرہم پٹی تم نے اپنے ہی ہاتھوں کر دی تھی۔ بھائی تمہارا اسی سے راضی ہوگیا ہوگا۔"

"ہاں جی!"— اُس نے کہا — "بھائی ہے، دشمن تو نہیں۔ میں نے اُس کے زخم پر خود دوائی لگائی اور پٹی باندھی تھی۔"

"تم دونوں کی ہاتھا پائی ہوئی تھی؟"

"وہ تو میرے گلے پڑ گیا تھا جی!"— اُس نے کہا — "تب میں نے

چاقو نکال کر اُسے ڈرایا۔"

میں ہنس پڑا۔ یہ بھی بناوٹی ہنسی تھی۔

"بختیار نے مجھے بتایا ہے کہ اُس نے دھوتی باندھ رکھی تھی"— میں نے کہا — "ہاتھا پائی میں دھوتی ڈھیلی ہوگئی تھی ورنہ وہ چاقو کا زخم نہ کھاتا.... اُس نے دھوتی باندھ رکھی تھی؟"

"ہاں جی!"— اُس نے کہا — "اُس نے دھوتی باندھ رکھی تھی۔"

"تمہارے ماں باپ نے تو شور مچا دیا ہوگا۔"

"انہوں نے بیچ بچاؤ کیا تھا"— اُس نے کہا — "ماں نے مجھے بہت گالیاں دی تھیں۔"

قمیض پر بھی خون کے چھینٹے تھے

مجھے مزید پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں بھائیوں کے بیانات میں فرق آپ نے بھی نوٹ کیا ہوگا۔ بختیار نے بتایا کہ اُس نے پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اُس کے بھائی کو میں نے اشارہ دیا کہ بختیار نے دھوتی باندھ رکھی تھی تو اُس نے یہی کہہ دیا کہ اُس نے دھوتی باندھ رکھی تھی۔ بختیار نے کہا کہ اُس نے ایک ڈسپنسر سے پٹی بندھوائی تھی۔ اُس کے بھائی سے میں نے کہلوالیا کہ بختیار کی مرہم پٹی اُس نے کی تھی۔ دونوں نے لڑائی جھگڑے کا وقت بھی مختلف بتایا تھا۔

میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ میں پاجامے اور دھوتی پر اتنا زور کیوں دے رہا ہوں۔ مجھے اُس پاجامے، دھوتی یا شلوار کی ضرورت تھی جو بختیار نے پہن رکھی تھی۔ اس میں اُس جگہ سے چاقو کے گذرنے کا نشان ہونا چاہئے تھا جہاں چاقو ٹانگ میں اُترا تھا۔ ایسی اشیاء عدالت میں پیش کی جاتی ہیں۔

میں نے بختیار کے ساتھ صاف بات کرنے کی بجائے شہادت اکٹھی کرنا بہتر سمجھا۔ سب سے پہلے تو میں نے کھوجی سے کہا کہ وہ بختیار کا کھُرا دیکھے۔ پھر میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ بختیار کے باپ کو اور اُس ڈسپنسر کو تھانے بلوائے جس سے بختیار نے مرہم پٹی کرائی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد کھوجی نے آکر بتایا کہ ملنگوں کے ساتھی پر حملے کی واردات میں موقعہ واردات سے تھوڑی دُور ایک دیوار کے ساتھ جو کھُرے دیکھے گئے تھے وہ بختیار کے تھے۔ میں نے کھوجی سے کہا کہ وہ ابھی بختیار کو نہ بتائے۔

کچھ اور وقت گزرا تو بختیار کا باپ آگیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ہندو ڈسپنسر بھی آگیا۔ میں نے بختیار کے باپ کو اپنے پاس بلا کر بٹھالیا۔ مجھے بختیار جیسے بیٹوں کے باپوں کی کمزوریوں کا علم تھا۔ یہ بوڑھا تو بہت ہی گھبرایا ہُوا تھا۔

"میری بات غور سے سننا بزرگوار!"— میں نے اُسے کہا — "میں آپ کو بڑی عزت سے تھانے سے رخصت کرنا چاہتا ہوں لیکن آپ کی عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے دونوں بیٹے جھوٹ بول چکے ہیں۔ اگر آپ نے جھوٹ بولا تو میں ان کے ساتھ آپ کو بھی حوالات میں بند کردوں گا۔ آپ کی بیوی کو بھی تھانے بلالوں گا اور آپ کے گھر کی تلاشی لوں گا۔"

"حضور!"— اُس نے ضعیفی اور خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "بالکل سچ بولوں گا۔"

"آپ کے بیٹے بختیار کی ٹانگ پر چاقو کس نے مارا تھا؟"— میں نے پوچھا۔

"مجھے اُس نے نہیں بتایا"— باپ نے جواب دیا۔

"کیا آپ کے بڑے بیٹے نے اُسے چاقو مارا تھا؟"

"مجھے یہ بھی معلوم نہیں"— اُس نے کہا — "بات یوں ہوئی تھی کہ صبح میں نے دیکھا کہ بختیار لنگڑا کر چل رہا تھا میں نے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ ٹانگ پر چوٹ آئی ہے۔"

"اُس نے کیا پہن رکھا تھا؟"

"شلوار"— باپ نے جواب دیا۔

"اُس شلوار پر خون ہوگا۔"

"اُس نے ماں سے کہا تھا کہ رات والی شلوار غسل خانے میں پڑی ہے اُسے دھو دینا"— اُس نے کہا — "ماں خون دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ اُس نے بختیار سے پوچھا کہ ٹانگ پر زخم کیسے آیا ہے تو اُس نے کہا تھا کہ رات اندھیرے میں گر پڑا تھا اور نیچے ایک لوہا پڑا تھا جس سے ٹانگ زخمی ہوگئی۔"

"کہیں دونوں بھائیوں کی آپس میں لڑائی تو نہیں ہوگئی تھی؟"

"میرے سامنے یا گھر میں تو نہیں ہوئی"۔۔۔ باپ نے جواب دیا۔

"میں نے سنا ہے کہ دن کے وقت دونوں بھائی لڑ پڑے تھے اور بڑے بھائی نے بختیار کو چاقو مارا ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اگر اُن کی لڑائی ہوئی تھی تو آپ نے انہیں چھڑایا تھا؟"

"یہ ہمارے کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "بھائیوں کی آپس میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔"

اس بوڑھے سے میں نے کئی اور سوال پوچھے۔ اُس نے جو بھی جواب دیے اُن سے بختیار اور اُس کے بڑے بھائی کے بیانات کی تردید ہوتی تھی۔ میں نے بوڑھے کو باہر بھیج دیا اور ڈسپنسر کو بلایا۔

"بختیار کے زخم کی پٹی تم کیا کرتے ہو؟"

"جی ہاں"۔۔۔ اس ادھیڑ عمر ہندو نے جواب دیا۔۔۔ "میں دو مرتبہ اس کی پٹی کر چکا ہوں۔"

"میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ تم جو کچھ کہو گے یہ تمہیں عدالت میں بھی کہنا ہو گا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تمہیں گواہی دینی ہوگی۔ جھوٹ بولو گے تو یہ جرم ہو گا.... پہلے یہ بتاؤ کہ پہلی پٹی کرانے کے لیے بختیار تمہارے پاس کس دن اور کس وقت آیا تھا؟"

اُس نے سوچ کر جواب دیا اور دن کی بجائے رات بتائی۔ یہ واردات کی رات تھی۔ وقت بھی اندازاً بتایا۔

"بختیار میرے گھر آیا تھا"۔۔۔ اُس نے بتایا۔۔۔ "میں سویا ہُوا تھا۔ اُس کی دستک پر آنکھ کھلی۔ دروازہ کھولا تو بختیار تھا۔ کہنے لگا کہ دو آدمی لڑ پڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ بختیار انہیں چھڑانے لگا تو چاقو اُس کی ٹانگ میں لگ گیا۔ میرے گھر میں دوائیاں اور پٹیاں رکھی تھیں۔ میں نے اسے کہا کہ کسی کے ساتھ لڑائی ہوگئی ہے تو مجھے بتا دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں پولیس کے چکر میں آجاؤں۔ اس نے مجھے دس روپے دیے اور کہا کہ مت گھبراؤ۔ میرے ساتھ کون لڑائی جھگڑا کر سکتا ہے.... پھر میں نے پٹی کر دی۔"

ذہن میں رکھیں کہ اُس وقت کے دس روپے آج کے ڈیڑھ سَو روپے

کے برابر تھے۔

"زخم کیسا تھا؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "گہرا تھا؟"

"دو انچ گہرا ہوگا"۔۔۔ ڈسپنسر نے جواب دیا۔۔۔ "اور تقریباً تین انچ لمبا ہے۔"

"شلوار تو خون سے لال ہوگی"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "قمیض پر بھی خون کے چھینٹے تھے؟"

"جی ہاں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "قمیض پر بھی خون کے چھینٹے تھے۔"

انوری نے کہا۔ "آئینے میں اپنی شکل دیکھ"

اب بات بالکل صاف ہو گئی تھی۔ ملنگ کے مضروب ساتھی پر حملہ کرنے والا بختیار تھا۔ میں نے اُسے اندر بلا کر بٹھا لیا۔

"بختیار بھائی!"۔۔۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ "آؤ اب سچ بولیں اور سچ سنیں۔ اب تم نے جھوٹ بولا تو اس کمرے سے بیہوشی کی حالت میں نکلو گے اور حوالات میں دو دن بیہوش پڑے رہو گے۔۔۔۔ تمہیں جب بھائی نے چاقو مارا تھا تو، تم کہتے ہو کہ، تم نے پاجامہ پہن رکھا تھا۔ میں تمہارے گھر کی تلاشی لوں گا۔ مجھے وہ پاجامہ دے دینا۔ اس میں سے چاقو گزرا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم نے چاقو کے اس زخم کے متعلق جھوٹ کیوں بولا ہے؟ مجھے کوئی تسلی بخش جواب دے دو اور جاؤ۔"

اُس کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر کی ہانک رہا تھا لیکن ایک بات شروع کرتا اور ہکلا کر کچھ اور کہنے لگتا۔ میں اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جب وہ ہکلا ہکلا کر خاموش ہُوا تو میں بولا۔

"تمہارے خلاف تین الزام ہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "میرے پاس تینوں کی شہادت موجود ہے۔۔۔۔ تم نے اپنے اور راحیلہ کے نوزائیدہ بچے کو قتل کیا اور لاش دفن کی ہے۔ تم نے انوری کو غائب کیا ہے اور تم نے ایک آدمی پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ کیوں نہیں تم اقبالِ جرم کر لیتے اور مجھ سے رعایت کی توقع رکھتے؟"

"خدا کے لیے مجھ پر یہ ظلم نہ کریں"۔۔۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر رندھیائی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ "میں آپ سے ایک عرض کرتا ہوں۔ ناراض نہ ہونا

ملک صاحب! اگر میرے دشمنوں نے آپ کو کچھ دے دلا کر میرے پیچھے ڈال دیا ہے تو مجھے بتائیں۔ میں اُس سے دُگنا نہیں تو ڈیڑھ گنا ضرور دوں گا۔"

"کیوں دو گے؟"۔۔۔ میں نے تحمل سے کہا۔۔۔ "تم بے گناہ ہو تو ثابت کر دو کہ بے گناہ ہو۔ میں تمہاری ہر بات مانوں گا لیکن ہر بات قابلِ قبول ہو۔ میں تم سے کچھ نہیں لوں گا، نہ میں نے کسی سے کچھ لیا ہے۔"

اُس نے سر جھکا لیا۔ میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے سر اٹھایا۔

"میں نے غلطی سے اس آدمی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا"۔۔۔ بختیار نے کہا۔

میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے کہا کہ یہ عجیب غلطی ہے۔

"غلطی یہ ہے جی کہ میں اس آدمی کو نہیں مارنا چاہتا تھا"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "میں نے صغیر کو مارنا تھا۔"

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی یار!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تم یوں کرو کہ یہ کہانی پوری سناؤ۔"

"وہ تو بڑی لمبی بات ہے جی!"

"جتنی بھی لمبی ہے سنا دو"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تم صغیر کو کیوں مارنا چاہتے تھے؟ اس آدمی کو کیوں مارا؟ کس طرح مارا؟۔۔۔۔ دو دن بولتے رہو، میں پوری توجہ سے سنتا رہوں گا۔"

اُس نے گھونٹ سا نگلا اور کہنے لگا۔۔۔ "آپ نے میرا چہرہ زخمی ہونے سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرا چہرہ کتنا بھدا اور بدشکل ہو گیا ہے۔ یہ صغیر نے کیا تھا۔ اُسے سزا ملنی چاہیے تھی لیکن نہ ملی۔ میں اپنا خون پی کے رہ گیا۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ انتقام لوں اور صغیر کا چہرہ بھی اسی طرح بگاڑ دوں لیکن میں ڈر گیا کہ پکڑا گیا تو بہت سزا ملے گی۔ میرا بڑا بھائی بھی کہتا رہا کہ انتقام لو لیکن میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا۔۔۔

"میں نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے یہ ارادہ کیا کہ شادی کر لوں اور

الگ تھلگ ہو کر آرام و سکون کی زندگی گذاروں .... آپ نے کہا ہے کہ میں پوری بات سناؤں۔ مجھ سے پوری بات ہی سن لیں۔ سچّی بات ہے ملک صاحب! مجھے تو خدا نے گناہوں کی سزا دنیا میں ہی دے دی ہے۔ میرے تو سارے بَل سیدھے ہو گئے تھے۔ میں نے دوسری شادی کا ارادہ کیا تو مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے مجھے کوئی گھرانہ رشتہ ہی نہ دے۔ ایک تو میں بدنام ہو گیا تھا، دوسرے میرا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ رشتہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ انوری اور راحیلہ موجود تھیں۔ میرا پہلا وعدہ چونکہ انوری کے ساتھ تھا اس لیے میں نے ایک روز، کوئی تین مہینے ہوئے انوری کے گھر جا کر اُسے کہا کہ وہ شادی کی تیاری کرے....

"انوری نے خوش ہونے کی بجائے گھور کر مجھے دیکھا اور بولی۔ 'جا اور آئینے میں اپنی شکل دیکھ .... منحوس! پھر کبھی میرے سامنے نہ آنا'۔ اُس نے مجھے دھتکار دیا۔ اس کے بعد راحیلہ تھی جو میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اُسے اس لیے شادی کے لیے نہ کہا کہ میرے گھر والے اسے اس حالت میں قبول نہیں کریں گے ....

"اس سے دس بارہ روز بعد کی بات ہے۔ میں گلی میں جا رہا تھا۔ سامنے سے تین عورتیں برقعوں میں آ رہی تھیں۔ اُن کے نقاب گرے ہوئے تھے۔ چال سے وہ جوان لڑکیاں معلوم ہوتی تھیں۔ میں ایک طرف ہو کر اُن کے قریب سے گذرنے لگا تو درمیان والی لڑکی رُک گئی۔ اُس نے نقاب اٹھا دیا۔ وہ میری پہلی بیوی تھی۔ اُس نے کہا۔ 'بختیار صاحب!'۔ میں رُک گیا۔ دوسری دو لڑکیاں بھی رُک گئیں....

"میری پہلی بیوی نے مجھے کہا۔ 'میری صورت تمہیں پسند نہیں تھی .... اب اپنی صورت دیکھو۔ لعنت برس رہی ہے۔ میرے خاوند کو دیکھنا۔ وہ تمہاری طرح کمینہ نہیں۔ اب افریقہ سے کوئی حبشن لے آنا'۔ اُس کے ساتھ کی دو لڑکیوں نے قہقہہ لگایا۔ میری پہلی بیوی بھی طنزیہ ہنسی ہنس کر بولی۔ 'جا، شکل دُور لے جا یہاں سے'۔ اور لڑکیاں ہنستی ہوئی چلی گئیں۔ میں پتھر کا بُت بن گیا۔ میری پہلی بیوی کی شادی کبھی کی ہو چکی ہے اور سنا ہے

کہ وہ خوش باش زندگی گذار رہی ہے ....

"اُس نے صرف مجھے ہی طعنہ نہیں دیا تھا۔ تین چار روز بعد کسی شادی پر میری ماں کی اُس کے ساتھ ملاقات ہو گئی۔ اُس نے میری ماں کو بھی ایسے ہی طعنے دیے اور اُس نے میری ماں سے یہ بھی کہا تھا کہ تمہارا بیٹا میری آنکھوں کے سامنے ذلیل اور خوار ہو گا۔ پھر اُس نے میرے بڑے بھائی کی بیوی تک یہ طعنے پہنچائے۔ میں اندر ہی اندر جلنے اور کُڑھنے لگا .... میرے لیے شادی ضروری ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ مجھے کوئی لڑکی خواہ خریدنی پڑے، مجھے شادی کرنی ہے تاکہ میں اپنی پہلی بیوی اور انوری کو شرمندہ کر سکوں۔ میری نظر میں ایک گھرانہ تھا۔ میں نے ماں سے کہا کہ وہ اُس گھر جا کر رشتے کی بات کرے۔ میری ماں اور بھابھی گئیں اور یہ جواب لے کر آ گئیں کہ بختیار کو رشتہ دے کر وہ اپنے خاندان کو بدنام نہیں کرنا چاہتے۔ میری ماں نے میری صفائی میں دو چار باتیں کیں تو لڑکی کی ماں نے کہا کہ بختیار کا چہرہ پسند نہیں....

"پھر پتہ چلا کہ انوری کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ یہ میرے دماغ پر ایک اور چوٹ تھی۔ انوری مجھے دھتکار کر کسی اور کے ساتھ چلی گئی تھی۔ صغیر پہلے بھی اسی شہر میں رہتا تھا۔ وہ بری ہو کر میرے سامنے آتا رہا۔ اُسے دیکھ کر مجھے غصہ تو بہت آتا تھا لیکن میرے دل میں کبھی کوئی خوفناک ارادہ نہیں آیا تھا۔ مجھے جب انوری نے دھتکار دیا، پہلی بیوی نے گلی میں روک کر مجھے ذلیل کیا اور ایک گھر سے رشتے کا جواب مل گیا تو صغیر کو دیکھ کر میری یہ حالت ہونے لگی جیسے غصے سے میرا دماغ پھٹ جائے گا....

"میری ذہنی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی۔ گھر میں ذرا ذرا سی باتوں پر مجھے غصہ آ جاتا۔ کسی کے ساتھ بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں ہر کسی کے ساتھ غصے سے بولتا تھا۔ ماں نے بات کی تو اُس پر غصہ جھاڑ دیا۔ باپ نے کچھ کہا تو اُس کے گلے پڑ گیا۔ بھائی کے ساتھ

تُو تُو میں میں ہو گئی۔ ایک بار بھابھی کو جلی کٹی سنا دیں....

"ایک روز بڑے بھائی نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر کہا ــــ 'میں جانتا ہوں کہ تمہاری یہ حالت کیوں ہو گئی ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ بُرے کام چھوڑ دو اور اپنے کاروبار کو سنبھالو۔ تم نے تو گھر میں قیامت کھڑی کر رکھی ہے' ــــ میں نے اُسے کہا کہ جب تک میں صغیر سے بدلہ نہیں لوں گا، میری حالت یہی رہے گی، بلکہ بگڑے گی....

"بھائی نے کہا کہ ہمت کرو اور صغیر کے چہرے کا یہی حال کر دو۔ اُس نے کہا کہ اُس کے منہ پر تیزاب پھینکو۔ میں نے کہا کہ جس طرح اُس نے میرے منہ پر کلہاڑی ماری ہے، اسی طرح میں اُس کے منہ پر کلہاڑی ماروں گا۔ پھر میں نے اور میرے بھائی نے یہی طریقہ طے کر لیا۔ میں کوئی موزوں موقع دیکھنا چاہتا تھا۔ سوچ سوچ کر مجھے خیال آیا کہ صغیر تکیے پر بھی جایا کرتا ہے۔ میں نے صغیر پر نظر رکھنی شروع کر دی لیکن یہ کام بہت مشکل تھا۔ میں نے ایک اور طریقہ سوچا.... میرا ایک جگری دوست ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ صغیر کو کسی رات تکیے پر بلائے اور مجھے بتا دے۔ دوست نے وجہ پوچھی تو میں نے اُسے وجہ بتا دی....

"میرے دوست نے تیسرے روز یہ انتظام کر دیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میرا ارادہ اسی طرح پورا ہو جائے گا جس طرح میں نے سوچا تھا۔ لیکن خدا کو جو منظور ہوتا ہے اُس کا سبب بن جاتا ہے۔ رات کو صغیر مجھے نظر آ گیا۔ میں بڑی تیزی سے اپنے گھر گیا اور کلہاڑی لے کر اُس گلی میں گیا جس میں صغیر گیا تھا۔ وہ مجھے اگلا موڑ مڑتا نظر آ گیا۔ میں راستہ چھوٹا کرنے کے لئے ایک اور گلی میں چلا گیا۔ وہ بھی میدان میں جاتی ہے....

"آگے اندھیرا تھا۔ صغیر تیز چل رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کوئی نہ تھا۔ خطرہ تھا کہ صغیر پیچھے نہ دیکھ لے۔ میدان میں ایک طرف تین احاطے ہیں۔ یہ محض چار دیواریاں ہیں۔ ان کے اندر زمینیں خالی ہیں، کوئی مکان نہیں۔ میں ان کے دوسری طرف چلا گیا اور خانقاہ کے قریب جا پہنچا۔ اندھیرے

میں صغیر کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں اور آگے گیا تو صغیر مجھے سائے کی طرح دکھائی دینے لگا۔ وہ آگے نکل گیا تھا....

"میں دبے پاؤں تیز چلتا اُس کے پیچھے پہنچ گیا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا تو میں نے کلہاڑی کا وار کیا۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے سر ایک طرف کر لیا تھا۔ کلہاڑی اُسے لگی۔ میں نے ایک بار پھر اُسے کلہاڑی ماری۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا لیکن یہ وار بھی اُس کے سر یا منہ پر نہ پڑا۔ اس کے فوراً بعد اُس کا چاقو میری ران میں گہرا اُتر گیا۔ اُس نے چاقو کو نیچے کی طرف کھینچا۔ اس سے میری ران لمبی کٹ گئی۔ میں نے اُس کی پیٹھ پر کلہاڑی ماری اور وہ گر پڑا۔ چاقو اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میری ران میں ہی رہا۔ میں بھاگ اٹھا اور چاقو میری ران سے گر کر نیچے جا پڑا۔ میں نے جن احاطوں کا ذکر کیا ہے، اُن کے قریب سے گزرتے کلہاڑی ایک احاطے میں پھینک دی۔

"میں اپنے گھر جانے کی بجائے ڈسپنسر کے گھر چلا گیا۔ اُس نے زخم دیکھا تو کہنے لگا کہ ہسپتال جاؤ، تم کسی سے لڑ کر آئے ہو۔ میں نے اُسے جھوٹ بتایا کہ میں لوہے کے ایک ٹکڑے پر گر پڑا تھا۔ اُسے دس روپے دیے تو اُس نے پٹی کر دی۔ شلوار خون سے لال ہو گئی تھی۔ اپنے گھر جا کر بڑے بھائی کو بتایا کہ میں کام کر آیا ہوں۔ وہ میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے خون سے رنگے ہوئے کپڑے دھوئے پھر سوچنے لگے کہ پکڑے گئے تو کیا کہیں گے۔ بڑے بھائی نے کہا کہ ایسی صورت آ گئی تو میں کہوں گا کہ میں نے تمہیں چاقو مارا ہے۔ یہ وہی بیان ہیں جو میں نے اور بڑے بھائی نے آپ کو دیے ہیں۔"

"تو تم نے صغیر کو مارا تھا" ــــ میں نے کہا۔

"جی، میں نے صغیر کو مارا تھا" ــــ اُس نے کہا ــــ "دوسرے دن یہ خبر مجھ تک پہنچی کہ صدقے کو رات کو کوئی زخمی کر کے پھینک گیا تھا اور اب وہ ہسپتال میں ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اُسے صغیر نے وہاں پڑا دیکھا تھا۔ اُس نے ملنگوں کو بتایا اور ملنگوں نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ میں نے صغیر

کو اچھا بھلا گھومتے پھرتے دیکھا۔ جو آدمی میرے ہاتھوں زخمی ہو گیا تھا، اُس کا قدوبت صغیر کے ساتھ ملتا جلتا تھا۔ اندھیرا بھی تھا۔ اس شخص کا نام صادق علی ہے اور اسے صِدقہ کہتے ہیں۔ شاید یہ غلط فہمی یوں ہوئی کہ صغیر کہیں پیچھے رُک گیا تھا اور صِدقہ آگے آگیا تھا۔"

قتل یا خودکشی؟

یہ بیان دے کر اُس نے منت سماجت شروع کر دی۔ کہنے لگا کہ صِدقہ غلطی سے اُس کے ہاتھوں زخمی ہو گیا ہے اس لیے میں اُسے چھوڑ دوں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ صِدقہ کچھ رقم لے لے اور راضی نامہ کر لے... صدقہ شاید رقم لے لیتا لیکن میں بختیار کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں صِدقے کے خلاف بختیار کی کوئی دشمنی ثابت کر دوں گا اور اس واردات کو قاتلانہ حملہ کہوں گا۔

میں تھک کر شل ہو چکا تھا۔ سوچنے کے لیے دماغ کو تر و تازہ کرنا تھا، لیکن بختیار کے گھر کی تلاشی اور خون والے کپڑوں کی برآمدگی ضروری تھی۔ میں نے بختیار کو ہتھکڑی لگوائی اور اُس کے گھر چلا گیا۔ محلّے کے دو آدمی ساتھ لے لیے۔ بختیار نے شلوار اور قمیض دے دی۔ میں نے شلوار کو اچھی طرح دیکھا۔ جہاں سے چاقو گذرا تھا وہاں سے شلوار کٹی ہوئی تھی۔ ان کپڑوں کی برآمدگی کی کاغذی کارروائی کی اور بختیار کو تھانے میں لاکر حوالات میں بند کر دیا۔

اگلی صبح کا واقعہ ہے کہ وحیدہ کا خاوند حفیظ تھانے میں آیا۔

"حفیظ بھائی!" — میں نے اُس کی بات سننے سے پہلے اُسے کہا — "سنا ہے اپنی بیوی کے ساتھ تمہاری ناچاقی ہو گئی ہے۔ کیا تم ابھی تک علیحدگی میں ہو؟"

"جی ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "اسی سلسلے میں ایک

شکایت لے کر آیا ہوں .... صغیر نے پریشان کر رکھا ہے۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"پہلے دو مرتبہ اُس نے مجھے کہا کہ میں وحیدہ پر شک نہ کروں اور اُسے اپنے گھر لے آؤں"— حفیظ نے کہا — "پھر ایک روز میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ تم ابھی تک وحیدہ کو گھر نہیں لائے۔ میں نے کہا کہ جب بہتر سمجھوں گا لے آؤں گا، تمہارے حکم سے نہیں لاؤں گا۔ اُس نے کہا کہ میں تمہیں کچھ مہلت دے دیتا ہوں، اُسے لے آؤ۔ گذشتہ روز وہ پھر آگیا۔ کہنے لگا کہ تم میری بات کو صاف ٹال گئے ہو۔ مجھے جانتے ہو کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ میری کوئی زندگی نہیں۔ مجھے نہ عمر قید کا ڈر ہے نہ پھانسی کا۔ کل شام وحیدہ کو میں اس گھر میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر نہ لائے تو میں بتا نہیں سکتا کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا.... یہ شخص مجھے پاگل لگتا ہے اور مجھے اس سے ڈر آنے لگا ہے۔"

"وحیدہ پر تم نے کس بنا پر شک کیا ہے!"— میں نے پوچھا —

"تم نے اپنی آنکھوں کچھ دیکھا ہے یا کسی سے سنا ہے؟"

"دیکھا بھی نہیں اور سنا بھی نہیں"— اُس نے جواب دیا —

"میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ کون کسی کی خاطر اپنے آپ کو سُولی پر کھڑا کرتا ہے!"

"صغیر جیسے آدمی اس سے بھی زیادہ حیران کُن مظاہرے کر سکتے ہیں"

— میں نے کہا — "میرا خیال ہے کہ تمہیں صغیر پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بدنیّت ہوتا تو تمہیں یہ نہ کہتا کہ وحیدہ کو گھر لے آؤ۔ وہ وحیدہ کو الگ رہتے دیکھ کر خوش ہوتا اور اُس کے پاس جاتا رہتا۔"

"شک کی ایک وجہ اور بھی ہے"— حفیظ نے کہا — "بجائے اس کے کہ وہ میرا شک رفع کرتی، اُس نے اپنا سامان اٹھایا اور اپنی ماں کے مکان میں چلی گئی، جیسے وہ مجھ سے علیٰحدگی کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔"

"کیا تم زِینو اور اس کی بیٹی انوری کے جال میں نہیں پھنس گئے تھے؟"

— میں نے کہا — "زِینو میرے پاس حوالات میں بند ہے۔ دائی بھی میرے پاس ہے۔ وہ دونوں مجھے بتا چکی ہیں کہ تم نے وحیدہ سے نظریں پھیر کر انوری کو دل میں بٹھا لیا تھا۔"

اُس نے سر جھکا لیا۔ میاں بیوی میں سمجھوتے کرانا تھانیدار کا کام نہیں ہوتا لیکن مجھے حفیظ اور وحیدہ کے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی میں چاہتا تھا کہ ان کی ناچاقی ختم کرا دوں۔ حفیظ کو میں نے انوری کا نام لے کر چُپ کرا دیا تھا۔ اُسے وحیدہ کے ساتھ اپنی بے وفائی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے وحیدہ کے متعلق چند اور باتیں کیں تو اُس نے وعدہ کیا کہ وہ اُسے اپنے گھر لے آئے گا۔

"اگر صغیر کی طرف سے تمہیں ذرا سی بھی شکایت ہوئی تو میرے پاس آجانا"— میں نے کہا۔

وہ چلا گیا۔

شام سے کچھ دیر پہلے حفیظ نے آکر بتایا کہ وہ وحیدہ کو گھر لے آیا ہے۔

وہ میرے پاس بیٹھا ہُوا تھا جب اُس پانی، پُڑیا والے کاغذ اور زِینو کے خاوند کے معدے وغیرہ کے ٹکڑوں کی رپورٹ آگئی۔ اس میں لکھا تھا کہ گلاس میں جو پانی تھا اس میں زہر ملا ہُوا تھا۔ کاغذ کے ٹکڑے پر اسی زہر کے ذرّات تھے اور لاش کو یہی زہر دیا گیا ہے۔

میں نے رپورٹ تیار کی کہ زِینو کے خاوند نے یہ زہر خود پیا ہے۔ میں نے اُس کے بیٹوں اور دائی کے تحریری بیان ساتھ نتھی کر دیے۔ اگر اُسے زِینو زہر دیتی تو زہر کی خالی پُڑیا وہاں نہ ہوتی۔ اُسے پانی اپنے بیٹے نے دیا تھا۔ مرنے والے کے بھائیوں نے تھانے میں آکر بہت شور مچایا لیکن میں نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ اُن کے بھائی نے خودکشی کی ہے۔

انوری کہاں جا پہنچی

اب مجھے بختیار کے خلاف شہادت تیار کرنی تھی کہ نوزائیدہ بچے کو اُس نے قتل کیا ہے۔ اُس پر دوسرا الزام ایک آدمی پر قاتلانہ حملہ تھا۔ اس کی شہادت کی فراہمی آسان تھی۔ میں ہسپتال راحیلہ کو دیکھنے گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بچّوں کی طرح رونے لگی۔ اپنے باپ کی موت کا اُسے بہت دُکھ تھا۔ میں نے اُسے بہلایا اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ پھر اُسے بتایا کہ وہ عدالت میں کیا بیان دے۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میں نے بختیار کو گرفتار کر لیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ راحیلہ جب بختیار کا نام سنتی تھی تو غصے سے اُس کے دانت بجنے لگتے تھے۔

دائی کو میں نے وعدہ معاف گواہ بنا لیا تھا۔ مجسٹریٹ سے اُس کا بیان قلمبند کر کے اُسے جوڈیشل حوالات میں بھجوا دیا۔ مقدمہ ختم ہوتے ہی اُسے رہا ہو جانا تھا۔ بختیار نے جس آدمی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا، اُسے میں نے بتایا کہ وہ بیان دے کہ بختیار کے ساتھ اُس کی دشمنی چلی آ رہی تھی جو جُوئے کے سلسلے میں تھی۔ دشمنی یہ بتائے کہ بختیار سے اس آدمی نے چار پانچ مرتبہ رقم جیتی تھی اور بختیار نے اُس کے ساتھ ایک مرتبہ لڑائی بھی کی، اور یہ بھی کہ واردات کے روز بھی بختیار کے ساتھ اُس کی لڑائی ہوئی تھی اور اُس نے بختیار کو بہت پیٹا تھا۔ میں نے تین ملنگوں کو گواہ بنا لیا جنہیں بیان دینا تھا کہ بختیار اور مضروب ایک دوسرے کے دشمن تھے۔

کیس تیار کرنے میں چار دن لگ گئے۔ میں نے کوئی خانہ خالی نہ رہنے دیا۔

کیس کی سماعت شروع ہو گئی۔ بڑا ہنگامہ خیز کیس تھا۔ بختیار کے وکیل نے سب سے زیادہ جس گواہ پر جرح کی وہ صغیر تھا۔ بختیار کا وکیل یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ صغیر پر بختیار پر قاتلانہ حملے کا کیس چل چکا ہے۔ بے شک صغیر عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا تھا لیکن اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ بختیار اور صغیر کی آپس میں دشمنی ہے اور صغیر جھوٹا گواہ ہے۔ وہ بختیار کو سزا دلانا چاہتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ صغیر ہر سوال کا جواب سوچ کر اور بڑے پختہ لہجے میں دیتا تھا اور راحیلہ نے وہی بیان دیے جو میں نے اُسے یاد کرائے تھے۔

مقدمے کے دوران ایک شام صغیر تھانے میں میرے پاس آیا۔

"آپ کو ایک راز کی بات بتانے آیا ہوں"۔۔۔ اُس نے کہا۔ "اگر آپ اس وقت غصّے میں نہ ہوں تو بتا دیں۔"

"فوراً بولو"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "ایک منٹ دیر نہ لگانا۔"

"یوں سمجھیں کہ میں اقبالِ جرم کرنے لگا ہوں"۔۔۔ اُس نے ذرا جھجک کر کہا اور میرا ردِعمل دیکھنے کے لئے میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں نے کہا ہے ایک منٹ دیر نہ لگاؤ"۔۔۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"انوری کو میں نے اغوا کیا تھا"۔۔۔ اُس نے کہا۔

میں نے اس طرح اُس کی طرف دیکھا جیسے اُس نے مجھے بے خبری میں سُوئی چبھو دی ہو۔

"ہاں ملک صاحب!"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "میں اپنے اس جرم کو چھپا سکتا تھا، بلکہ یہ جرم چُھپ چکا ہے لیکن آپ کو یہ راز بتا کر میں آپ کا ایک مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ انوری کے ماں باپ نے اُس کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں لکھوائی تھی۔ میری بات سُن کر آپ ایک تفتیش سے بچ جائیں گے۔"

"تمہاری مہربانی کا شکریہ!"۔۔۔ میں نے غصے کو دباتے ہوئے کہا

—"اب بتاؤ کہ تم نے اُسے کیوں اغوا کیا تھا؟ کیسے کیا تھا اور وہ اب کہاں ہے؟"

"اب وہ شاید دہ دہلی میں ہے"— اُس نے کہا —"ایک امیر اور معزز آدمی نے اُس کے ساتھ شادی کر لی ہے۔"

"اُس کے ہاتھ کتنے میں بیچی تھی؟"— میں نے پوچھا۔

"بیچی نہیں ملک صاحب!"— اُس نے کہا —"میں بردہ فروش نہیں ہوں۔ میری بات سُن لیں۔ آپ کو سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے .... آپ نے پہلے دیکھ لیا ہے کہ میں وحیدہ کی محبت میں پاگل ہو چکا ہوں۔ آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ میں وحیدہ کے لئے کسی کو قتل کر کے اپنے آپ کو پھانسی کی سزا دلا سکتا ہوں۔ وحیدہ کے ساتھ مجھے عشق ہے اور میں اُسے مقدّس عورت سمجھتا ہوں۔ میرا عشق روح میں اتنا گہرا اُترا ہُوا ہے کہ میں وحیدہ کو گوشت اور ہڈیوں کا جسم سمجھتا ہی نہیں۔ وہ ایک روح ہے جو میرے جسم میں داخل ہو گئی ہے یا میری روح اُس کے جسم میں چلی گئی ہے۔ میں اُسے دیکھتا ہوں تو مجھ پر عجیب طرح کا نشہ طاری ہو جاتا ہے....

"ایک روز مجھے پتہ چلا کہ وحیدہ اپنے خاوند حفیظ سے الگ ہو گئی ہے اور اپنی ماں کے مکان میں چلی گئی ہے۔ مجھے یہ بات رُجّی نے بتائی تھی۔ اُس نے وجہ یہ بتائی کہ حفیظ نے وحیدہ کے چال چلن پر شک کیا ہے اور اُسے کہا ہے کہ صغیر کے ساتھ تمہارے درپردہ تعلقات ہیں۔ مجھے یہ سُن کر آگ لگ گئی حفیظ مجھے ماں بہن کی گالیاں دے لیتا، وحیدہ پر اتنا ذلیل الزام نہ لگاتا....

"رجّی نے مجھے ایک اور بات بتا کر پریشان کر دیا۔ اُس نے کہا —'بدچلن وحیدہ نہیں، حفیظ خود بدچلن ہو گیا ہے۔ اُس پر زینو کا جادو چل گیا ہے۔ زینو نے اُسے انوری کے لیے پھانس لیا ہے۔ تم شاید نہیں جانتے کہ انوری وحیدہ جیسی خوبصورت ہے لیکن انوری نے اپنے آپ میں ماں کی ٹریننگ سے جو کشش پیدا کر لی ہے وہ وحیدہ میں نہیں۔ وحیدہ کھری اور سیدھی بات کرنے والی عورت ہے۔ انوری نے حفیظ کو اتنا زیادہ اپنے قابو میں کر لیا ہے کہ وہ

رات کو اُس کے گھر جاتا ہے۔ بس اس بات پر وحیدہ اور حفیظ کی اَن بن ہو گئی ہے۔ زینو نے پہلے بختیار سے اُس کی بیوی کو طلاق دلائی تھی، اب وہ حفیظ سے وحیدہ کو طلاق دلائے گی'....

"میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ یہ خبر سُن کر میری کیا حالت ہوئی۔ میں نے شام کے بعد وحیدہ کا جا در وازہ کھٹکھٹایا۔ اُس نے دروازہ کھولا تو میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اپنی ماں کے مکان میں کیوں آ گئی ہے۔ اُس نے کہا کہ اندر آ جاؤ۔ میں نے کہا —'وحیدہ! میں تمہیں بدنام نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہارے گھر میں قدم رکھنے کے قابل نہیں'— لیکن اُس نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے اندر لے گئی۔ مجھے بٹھا کر کہنے لگی —'میں صرف خدا سے ڈرتی ہوں۔ اُس کے بندوں کا مجھے کوئی ڈر نہیں۔ اپنی نیّت صاف ہونی چاہیئے'....

"اُس نے اپنے خاوند سے الگ ہونے کی وہی وجہ بتائی جو مجھے رجّی بتا چکی تھی۔ اُس نے نئی بات یہ بتائی کہ انوری وحیدہ سے ملنے کے بہانے اُس کے گھر جاتی تھی۔ ایک روز وحیدہ گھر نہیں تھی۔ وہ واپس آئی تو اُس نے حفیظ اور انوری کو ایسی حالت میں دیکھا جسے کوئی بیوی برداشت نہیں کر سکتی .... میں نے وحیدہ سے پوچھا کہ وہ خاوند کی غلط فہمی رفع کرنا چاہتی ہے؟ اُس نے کہا کہ دنیا میں اُس کا رہ ہی کون گیا ہے۔ حفیظ ہی تھا۔ اُس پر بھی کسی کا قبضہ ہو گیا ہے....

"وحیدہ بہت روئی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں کچھ بندوبست کر دوں گا۔ اُسے تسلّی دلاسہ دے کر میں وہاں سے آ گیا۔ دوسرے دن حفیظ سے ملا اور شرافت سے اُسے کہا کہ وہ وحیدہ کو ایسی عورت نہ سمجھے کہ مجھ جیسے فضول آدمی کے ساتھ یارانہ لگا لے گی۔ تم اُسے اپنے گھر لے آؤ....

"حفیظ نے مجھ پر رعب جھاڑنا شروع کر دیا اور اُس نے ایک دو ایسی باتیں بھی کہہ دیں جو میں نے صرف اس لیے برداشت کیں کہ میرا ارادہ وحیدہ کو اس گھر میں آباد کرنے کا تھا۔ اگر وحیدہ کا خیال نہ ہوتا تو حفیظ کی لاش بھی نہ پہچانی جاتی.... اس کے بعد میں نے وحیدہ کے گھر پر نظر رکھی اور راتوں کو میں حفیظ

کے گھر کو بھی کبھی کبھی دیکھتا تھا....

"ایک روز میں پھر وحیدہ سے ملا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھے بتائے۔ اُس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگی کہ اس زندگی سے تو مرجانا بہتر ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُسے پتہ چلا ہے کہ انوری تیسری چوتھی رات حفیظ کے گھر جاتی ہے.... ملک صاحب! میں پاگل ہوں۔ میں نے ایک ارادہ کر لیا۔ اس کے لیے میں نے ایک آدمی کو ساتھ ملا لیا۔ وہ میرا بڑا ہی گہرا دوست ہے۔ وہ بھی میری طرح پاگل ہے....

"خاموشی سے چلی چلو"

"میں ہر رات حفیظ کے گھر پر نظر رکھنے لگا۔ ایک رات انوری کو میں نے حفیظ کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ پہلے تو میں اس پر حیران ہُوا کہ انوری پردہ نشین لڑکی ہُوا کرتی تھی۔ بختیار نے اُسے غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ پھر بھی وہ پردے میں رہتی تھی مگر اب اُس کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ رات کو اکیلی ایک غیر مرد کے گھر چلی جاتی ہے۔ میں اپنے دوست کو بلا لایا۔ ہم ایک کمبل بھی ساتھ لے آئے اور گلی کی نکڑ پر انتظار کرنے لگے....

"انوری ایک گھنٹے بعد نکلی اور بہت تیز چلتی ہمارے قریب سے گذری۔ اُس نے برقعے کی بجائے چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ گلیاں ویران اور سنسان تھیں۔ انوری ہمیں دیکھ کر ذرا جھجکی اور اُس نے چادر اپنے سر سے سرکا کر چہرے پر کر لی۔ میں نے پیچھے سے کمبل اُس کے اوپر ڈال دیا اور اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میرے دوست نے بھی اُسے دبوچ لیا اور کہا — 'تڑپو گی تو جان سے مار دیں گے۔ خاموشی سے چلی چلو۔ جلدی چھوڑ دیں گے۔'

"جلدی چھوڑ دینے کا مطلب اُس نے کچھ اور سمجھا ہو گا۔ وہ کوئی شریف لڑکی تو نہیں تھی۔ اُس کا تڑپنا بند ہو گیا۔ میرے دوست نے اُسے کندھے پر ڈال لیا اور ہم گلیوں سے نکل کر میدان میں چلے گئے۔ بہت آگے جا کر انوری کو کندھے سے اتارا اور اُسے کہا کہ وہ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلی چلے۔ وہ ابھی تک کچھ اور سمجھ رہی تھی۔ وہ چند قدم چل کر رُک جاتی اور کہتی کہ دُور نہ لے چلو، مجھے گھر جانا ہے۔ میں نے آخر اُسے کہا کہ ہم اُسے اُس مقصد کے لیے نہیں لائے جو وہ سمجھ رہی ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اُسے ہم جہاں کہیں بھی لے جائیں گے،

کوئی آدمی اُس کے جسم کو بُری نیت سے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اُس نے بہت پوچھا کہ ہم اُسے اپنا ارادہ بتا دیں لیکن میں اُسے دو چار دن قید میں رکھ کر بتانا چاہتا تھا کہ وہ حفیظ کے ساتھ دوستی توڑ لے۔ میں خوف سے اُسے بے حال کرنے کا ارادہ کئے ہُوا تھا....

"وہ دو تین بار بیٹھ گئی۔ آگے نہیں جاتی تھی۔ ہم دونوں نے اُسے قتل کی دھمکی دی تو وہ چل پڑی۔ ہم اُسے چھ سات میل دُور ایک گاؤں میں لے گئے اور وہاں اپنے ایک دوست کو جگایا۔ وہ اُس علاقے کا بدمعاش ہے اور میرے دوست کا دوست ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں نے اس لڑکی کو کیوں اغوا کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس لڑکی کے ساتھ میرا وعدہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی آدمی چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا۔ میرے دوست نے اپنے دوست سے کہا کہ یہ امانت ہے اور اسے ہم واپس لے جائیں گے....

"ہم واپس آگئے۔ تین چار دن گذر گئے تو میں حفیظ سے پھر ملا اور اُسے کہا کہ وہ وحیدہ کو گھر لے آئے لیکن اُس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ وہ غصے میں تھا۔ اُسے پتہ چل چکا تھا کہ انوری لاپتہ ہوگئی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ جس لڑکی کے پیچھے اُس نے وحیدہ جیسی بیوی سے قطع تعلق کر لیا ہے وہ کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ حفیظ کا غصہ اور بڑھ گیا۔ پھر میں نے اُسے قتل کی دھمکی دی....

"میں نے ایک روز پھر حفیظ کے گھر جا کر اُسے کہا کہ اگر وہ وحیدہ کو گھر نہ لایا تو میں اُسے قتل کردوں گا۔ میں نے قتل کی تاریخ بھی اُسے بتا دی۔ وہ آپ کے پاس آگیا.... ایک روز میں اور میرا دوست وہاں گئے جہاں ہم انوری کو چھوڑ آئے تھے مگر انوری وہاں نہیں تھی۔ اُس آدمی نے بتایا کہ لڑکی ایک بڑے امیر آدمی کے ساتھ چلی گئی ہے اور اُس نے لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ میں گالی گلوچ پر اُتر آیا اور اُس شخص سے کہا کہ اُس نے لڑکی بیچ ڈالی ہے۔ اُس نے قسمیں کھائیں اور کہا کہ وہ ہمیں لڑکی تک لے جاسکتا ہے۔ ہم خود جا کر لڑکی سے پوچھ لیں کہ اُسے زبردستی بیوی بنایا گیا ہے یا وہ خود بنی ہے....

"اس آدمی نے ہمیں بتایا کہ ہُوا کیا تھا۔ آپ نے اس کا نام شاید سنا ہو۔

اعجاز نام ہے اور اِجّا کے نام سے مشہور ہے۔ اُس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں"۔

"ہاتھ تمہارے بھی بڑے لمبے معلوم ہوتے ہیں"— میں نے صغیر سے کہا — "میں اُس تھانے میں بھی رہ چکا ہوں جہاں اِجّا رہتا ہے۔ اب یہ خیال رکھنا کہ تم مجھے اتنا لمبا چوڑا بیان جو دے رہے ہو، اس میں جھوٹ شامل نہ کرنا۔ میں چھوڑوں گا نہیں۔"

اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "جناب ملک صاحب! آپ کو انوری کے اغوا کی ہوا بھی نہیں مل سکتی تھی لیکن میں آپ کو ساری واردات اور اس کا انجام بتا رہا ہوں۔ میں نے ابھی آپ سے یہ عرض نہیں کی کہ مجھے چھوڑ دیں۔ مجھے پکڑ لیں، سزا دلوائیں۔ میں نے جو نیکی کی ہے وہ پوری ہوگئی ہے۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

میں اعجاز عرف اِجّا کو جانتا تھا۔ وہ اُس قسم کے بدمعاشوں میں سے تھا جو جرم کرتے نہیں جُرم کراتے ہیں اور مجرموں کی پشت پناہی ایسے طریقوں سے کرتے ہیں کہ پکڑے نہیں جاتے۔ اُس زمانے میں ہندوستان میں چھوٹی بڑی ریاستیں اور جاگیریں تھیں۔ یہ انگریزوں کی عطا کی ہوئی تھیں۔ جاگیردار ہوتے تھے، راجے اور مہاراجے ہوتے تھے جن کی حیثیت بادشاہوں جیسی ہوتی تھی۔ اِجّا کی کلاس کے آدمی جاگیرداروں اور نوابوں کے ساتھ میل جول رکھتے تھے۔ بڑے مہاراجوں کے خاص درباریوں کے ساتھ ان کا رابطہ ہوتا تھا۔

انگریزوں کی بادشاہی کے اندر اِن چھوٹے چھوٹے دیسی بادشاہوں کی زندگی عیش و عشرت میں گزرتی تھی اور انہیں نئی سے نئی لڑکیوں کی ضرورت رہتی تھی۔ اُن کی یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے اِجّا جیسے آدمی مصروف رہتے تھے لیکن لڑکیوں کو زبردستی اغوا نہیں کیا جاتا تھا۔ ایسی لڑکیاں (ہندو، مسلمان اور اینگلو انڈین بھی) مل جاتی تھیں جو پنجرہ توڑ کر کہیں نکل جانے کو تڑپتی رہتی تھیں۔ ان میں انوری اور راحیلہ جیسی لڑکیاں بھی ہوتی تھیں جنہیں ماؤں نے غلط راستے پر ڈال دیا ہوتا تھا۔ ان میں وہ لڑکیاں بھی ہوتی تھیں جنہیں ماں باپ آزادی اور دولت مندی کا نشہ بنا دیتے تھے۔

ایسی لڑکیاں تلاش کر لی جاتیں اور انہیں کسی نہ کسی نواب، جاگیردار یا کسی راجے مہاراجے کے پاس پہنچا دیا جاتا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ یہ لڑکیاں اپنے آپ کو اغوا کرتی تھیں اور اجّا جیسے آدمی انہیں اغوا ہونے میں مدد دیتے تھے۔ صغیر نے اپنے بیان میں کہا کہ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اجّا یہ کام بھی کرتا ہے۔ اُسے اِجّا کے پاس جانے کا مشورہ اُس کے دوست نے دیا تھا۔ صغیر اُسے پہلے مل چکا تھا۔

بیوی مرگئی تو خاوند خوش ہُوا

صغیر نے اپنے جرم کی باقی کہانی یوں سنائی ــــ "اِجّا نے مجھے بتایا کہ جس روز ہم انوری کو اُس کے پاس چھوڑ آئے، اُس سے دو روز بعد شاہدرہ دہلی کا ایک بڑا امیر آدمی اِجّا سے ملا۔ اُسے باقاعدہ بیوی کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے اِجّا انوری سے پوچھ چکا تھا کہ وہ کون ہے۔ انوری اُس کی منّت سماجت کر رہی تھی کہ اُسے چھوڑ دیا جائے۔ اِجّا نے اُسے کسی طرح بھی پریشان نہیں کیا تھا۔ انوری نے اُسے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ اُس نے اِجّا کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اُس کی چھوٹی بہن کو ناجائز بچّہ پیدا ہونے والا ہے۔ اِجّا نے اپنی زبان سے کہا کہ اُس نے انوری کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور اُسے بڑا بھیانک مستقبل دکھا کر اُسے شیشے میں اتار لیا۔"

صغیر نے بڑی ہی لمبی کہانی سنائی جو مجھے اس لیے سننی پڑی کہ انوری کی گمشدگی کی رپورٹ درج ہو چکی تھی۔ مجھے اس فائل کا پیٹ بھرنا تھا اور یہ بھی دیکھنا تھا کہ یہ جرم کتنا سنگین ہے اور اسے گول کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ میں صغیر کا باقی بیان اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں۔ اُس کے بیان کا یہ حصّہ ایسا تھا کہ مجھے سوال و جواب بھی کرنے پڑے۔ اس سے یہ بات اور زیادہ لمبی ہو گئی۔

انوری کو ابھی پتہ نہیں چلا تھا کہ راحیلہ کا بچہ پیدا ہو چکا ہے اور وہ زیرِ حراست ہے اور اس کی ماں گرفتار ہو چکی ہے اور اس کا باپ مر گیا ہے۔ اِجّا کے کہنے کے مطابق وہ آدمی جسے بیوی کی ضرورت تھی، امیروں کی طرح عیاش نہیں تھا۔ اُس کی پہلی بیوی مرگئی تھی اور وہ خوش تھا کہ وہ مر گئی ہے۔ خوشی کی وجہ یہ تھی کہ

پہلی بیوی اُس کے تایا کی بیٹی تھی جو اُس پر خاندانی رسم و رواج کے مطابق مسلّط کی گئی تھی۔ اُس کا رنگ سانولا اور چہرہ مہرہ ایسا ویسا ہی تھا۔ طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے اُس میں شگفتگی نام کو نہیں تھی۔

اس شخص نے خاندان کے نام پر اس بیوی کو آباد رکھا۔ وہ خود زندہ دل اور اچھے ذوق کا آدمی تھا۔ اِس بیوی سے دو بچے پیدا ہوئے۔ دونوں دو دو سال کی عمر میں مر گئے۔ آٹھویں سال وہ بھی مر گئی۔ خاوند نے ان سات آٹھ سالوں میں گھر میں مسکراہٹ نہ دیکھی، سکون نہ دیکھا۔ بیوی مر گئی تو خاوند کو اُس کے مرنے کی خوشی ہوئی اور دوسری خوشی یہ ہوئی کہ خاندان میں اور کوئی لڑکی یا جوان بیوہ نہیں تھی جو اُس پر مسلّط کی جاتی۔ اُس نے اپنی پسند کی شادی کا ارادہ کر لیا۔

اِجّا کے ساتھ اُس کی ملاقات اپنے ایک جاگیردار دوست کے ساتھ دِلّی میں کہیں ہوئی تھی۔ اُس کا یہ دوست فوج میں لفٹننٹ تھا۔ مجھے یہ تفصیل نہیں بتائی گئی کہ اِجّا کے ساتھ اس شخص کی ملاقات کس طرح ہوئی تھی۔ بعد میں جب میرا اے۔ ایس۔ آئی اِجّا سے ملا اور اُس کا بیان لیا تو اُس نے بتایا کہ اس لفٹننٹ کے ایک چچا کو اِجّا نے ایک بار بڑی اچھی لڑکی دی تھی۔

اب انوری کے خاوند کا تعارف اِجّا سے ہُوا تو لفٹننٹ نے اُسے انوری کے خاوند کے متعلق بتایا کہ یہ کسی بڑی ہی خوبصورت لڑکی کی تلاش میں ہے۔ میں حیران ہُوا کہ امیروں کے لیے رشتوں کی کمی نہیں تھی۔ پھر اُس نے اِجّا سے لڑکی کی فرمائش کیوں کی تھی۔ وہ شاید ایسی لڑکی چاہتا تھا جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔

بہرحال صورت یہ پیدا ہو گئی کہ یہ شخص اِدھر کسی سے ملنے آیا تھا اور جسے ملنے آیا تھا وہ اُسے شکار پر لے گیا تھا۔ اس علاقے میں مرغابی اور تیتر کا بہت شکار تھا۔ اِجّا کا ٹھکانہ اسی علاقے میں تھا۔ اتفاق سے اجّا سے اُس کی ملاقات ہو گئی۔ اِجّا نے اُسے بتایا کہ ایک لڑکی آئی ہے۔ اُس نے انوری کے متعلق اُسے سب کچھ بتا دیا۔ کچھ بھی نہ چھپایا اور یہ بتایا کہ لڑکی

کا حسن بے مثال ہے۔

اُس نے اِجّا کے گھر جا کر انوری کو دیکھا تو انوری کا ہی ہو کے رہ گیا۔ انوری کو میں نے بھی دیکھا تھا۔ اُس کی خوبصورتی میں اور اُس کی آنکھوں میں کوئی اثر تھا جو میں نے بھی محسوس کیا تھا۔ اِجّا نے انوری کو ذہنی طور پر پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ اُس نے اِس آدمی کو پسند کر لیا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ظاہر ہے کہ اِجّا نے یہ لڑکی مفت دے دی ہو گی۔ اُس نے صغیر سے کہا کہ اُس آدمی نے انوری کے ساتھ شادی کر لی ہے اور انوری وہاں خوش ہے۔

صغیر نے یہ واردات دبائے رکھی کیونکہ اِدھر راحیلہ کے نوزائیدہ بچے کا کیس ہو گیا تھا۔ وہ اِس انتظار میں تھا کہ یہ کیس ختم ہو جائے تو وہ مجھے بتائے گا۔ چنانچہ اب اُس نے مجھے بتا دیا۔

میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو یہ تفصیلات سنا کر کچھ ہدایات دیں۔ مجھے پوری تفتیش کرنی تھی۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ صغیر کو اِجّا نے ساری بات ہی غلط بتائی ہو اور کسی وقت یہ لڑکی ان لوگوں کی قید سے فرار ہو کر کسی اور جگہ پولیس کے پاس جا پہنچے اور انکشاف ہو جائے کہ اس لڑکی کی گمشدگی کا کیس میرے تھانے میں درج رجسٹر تھا اور تھانے نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ یہ صحیح تھا کہ اُس کی گمشدگی کے کیس کی بازپُرس اور پیروی کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ باپ مر گیا تھا۔ ماں جیل میں تھی۔ بھائی بیکار سے لڑکے تھے، پھر بھی میری گردن اس کیس میں پھنسی ہوئی تھی۔

میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ اعجاز عرف اِجّا کو تھانے میں لانے کا انتظام کرے۔ صغیر سے اُس کا اتا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ صغیر کو میں نے حراست میں تو نہ لیا لیکن اُسے تھانے سے جانے بھی نہ دیا۔ وہ اغوا کا ملزم تھا۔

تباہی کا دوسرا پہلو دیکھو

اِجّا دوسرے دن آگیا۔ میں نے اُسے کہا کہ انوری جس طرح اُس کے پاس پہنچی اور جس طرح اُس نے رخصت کی، وہ بتا دے۔ میں نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو کچھ سمجھا کر بھیجا تھا۔ اِجّا کو اُس نے میری ہدایات کے مطابق دو چار باتیں کہہ کر آنے کو کہا تھا۔ اِجّا بڑی دلیری سے آیا تھا۔ اگر اُسے اے۔ ایس۔ آئی اس طرح لاتا جس طرح کسی مشتبہ یا ملزم کو لایا جاتا ہے تو اِجّا آتے ہی جھوٹ بول دیتا۔ کہتا کہ انوری کو اُس نے دیکھا تک نہیں، نہ وہ صغیر اور اُس کے دوست کو جانتا ہے۔ وہ میرے پاس آیا تو میں نے بھی اُسے کچھ باتیں ایسی کہیں کہ اُس نے سچ بولا۔

"اگر آپ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "لیکن آپ کو حاصل کچھ بھی نہ ہوگا۔ میرے خلاف آپ کو شہادت اور ثبوت نہیں ملے گا۔ میں آپ کو ساری بات بتا دیتا ہوں۔"

اُس نے بات بتا دی۔ یہ وہی بات تھی جو مجھے صغیر سنا چکا تھا۔

"میں آپ کو وہاں تک لے جا سکتا ہوں جہاں انوری گئی ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "اور اُس کے خاوند سے بھی ملوا سکتا ہوں۔ میں وہاں گیا تھا۔ آخر مجھے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا تھا۔ انوری کے خاوند نے پورا انتظام کر لیا تھا۔ اُس نے ایک مجسٹریٹ کے پاس لڑکی کو لے جا کر اُس کا بیان حلفی قلمبند کرا لیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اس شخص کے ساتھ آئی ہے اور اُس نے اپنی مرضی سے اس کے ساتھ شادی کر لی ہے .... آپ جانتے ہیں کہ لڑکی بالغ ہے۔ اُس کا بیان عدالت میں قبول ہوتا ہے .... آپ وہاں جا کر بیان کی نقل لے سکتے ہیں۔"

"وہ تو لینی پڑے گی"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "لڑکی سے ملنا ضروری ہے .... اُسے یہ تو معلوم ہی نہ ہوگا کہ اُس کی ماں جیل کی حوالات میں ہے اور اُس کا باپ مر گیا ہے۔"

"میں نے اُسے بتا دیا ہے"۔۔۔ اِجّا نے کہا۔۔۔ "صغیر جب دوسری بار میرے پاس آیا تھا تو اُس نے مجھے بتایا تھا۔ مجھے یہ یقین کرنے کے لیے شاہدرہ دہلی جانا تھا کہ انوری کو واقعی اس شخص نے بیوی بنا لیا ہے اور اُس کا بیان حلفی لے لیا ہے۔ میں جلدی نہ جا سکا۔ بہت دنوں بعد گیا۔ انوری کو میں نے بہت خوش دیکھا۔ میں یہی دیکھنے گیا تھا۔"

یہاں میں ذرا سی وضاحت کر دوں۔ اِجّا کو انوری کے ساتھ ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ جا کر دیکھتا کہ وہ خوش ہے یا نہیں۔ وہ دیکھنے گیا تھا کہ لڑکی کہیں فرار تو نہیں ہو گئی۔ اِجّا کے دل میں وہی ڈر تھا جو میرے دل میں تھا۔ میں یہ بھی واضح کر دوں کہ میں تھانیدار تھا۔ مجھے ایسی مجبوری نہیں تھی کہ میں اِجّا جیسے بدمعاشوں کے ساتھ یوں دوستانہ طریقے سے باتیں کرتا جس طرح میں کر رہا تھا۔ میرے لیے بڑا سیدھا راستہ تھا کہ صغیر اور اُس کے ساتھی کو گرفتار کر لیتا، پھر ان کی نشاندہی پر اِجّا کو گرفتار کرتا اور اُس کی نشاندہی پر شاہدرہ دہلی جا کر اُس آدمی کے گھر چھاپہ مارتا جس کے متعلق بتایا جا رہا تھا کہ اُس نے انوری کے ساتھ شادی کر لی ہے، لیکن میں نے کچھ اور سوچا تھا۔ میری سوچ میں انوری کی بھلائی بھی تھی۔ اگر میں اُسے برآمد کر کے اُس کے بھائیوں کے حوالے کر دیتا اور اگر شاہدرہ والے آدمی نے اُس کے ساتھ شادی نہ کر لی ہوتی تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ انوری کا مستقبل کیا ہوتا۔ اُس کے دونوں بھائی تو لڑکیوں جیسے تھے۔ انوری جیسی بدنام لڑکی کے ساتھ شادی کس نے کرنی تھی۔ انوری کے بھائی اور بھائیوں کے یار انوری کو کسی اور راستے پر چلا لیتے۔ ملک میں ایک طوائف کا اضافہ ہو جاتا۔ لہٰذا مجھے یہ یقین کرنا تھا کہ انوری کسی گھر میں بیوی بن کر آباد ہو گئی ہے۔

"وہ اتنی خوش تھی کہ اُس نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اُس کی زندگی

سنوار دی ہے"۔ اِجّا نے کہا — "میں نے اُسے بتایا کہ اُس کی بہن نے ایک بچے کو جنم دیا تھا جسے مار کر کہیں دبا دیا گیا تھا لیکن لاش ننگی ہو گئی اور پولیس کو اطلاع ہو گئی۔ اتنا ہی سُن کر انوری کا رنگ زرد ہو گیا۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ اُسے اگلی خبر سناؤں لیکن ایک خیال آگیا اور میں نے بتا دینا بہتر سمجھا۔ میں نے جب پوری خبر سنائی تو اُس کے آنسو بہنے لگے۔ پھر وہ ہچکیاں لینے لگی۔"

"اُس کا خاوند وہاں نہیں تھا؟"

"وہ پاس بیٹھا ہُوا تھا" — اِجّا نے جواب دیا — "یقین کریں ملک صاحب! وہ بہت ہی اچھا آدمی ہے۔ اُس نے انوری کو وہی بات کہہ دی جو میں کہنا چاہتا تھا۔ اسی بات کو ذہن میں رکھ کر میں نے اُس کے خاندان کی تباہی کی خبر اُسے سنا دی تھی۔ اُس کے خاوند نے اُسے کہا — 'تم اس تباہی کا دوسرا پہلو دیکھو۔ اگر تم اس وقت اپنے گھر ہوتیں تو تمہارا کیا حال ہوتا۔ تم شہر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتیں۔ تھانے اور کچہریوں کے چکر الگ تھے۔ لوگ تمہارا تماشہ دیکھتے۔ تمہارے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ ہوتا۔ خدا نے تم پر کرم کیا ہے کہ تم اُس گھر سے پہلے ہی نکل آئی ہو اور تمہارا ٹھکانہ بن گیا ہے'۔۔۔

"انوری پر اس کا اچھا اثر ہُوا۔ کہنے لگی — 'میری ماں کو پھانسی کی سزا ملے تو میری روح کو بھی چین آجائے۔ مجھے راحیلہ کا بھی غم نہیں۔ بختیار کے ساتھ میری شادی ہو جاتی لیکن راحیلہ نے اُسے مجھ سے چھین لیا۔ ماں نے بھی اُسے نہ روکا۔ راحیلہ نے مجھے طعنے دیے تھے کہ وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے اور بختیار اُسے پسند کرتا ہے۔ خدا نے اُسے کیے کی سزا دی ہے'۔ — وہ ایسی ہی باتیں کرتی رہی اور میں اپنی تسلّی کر کے واپس آگیا۔"

اِجّا نے اپنی تسلی تو کر لی تھی لیکن مجھے اپنی تسلّی کرنی تھی۔ میں نے فوری کارروائی کی۔ یہ کیس اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو دے دیا۔ اُسے میں پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ اس کیس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ اُسے کہا کہ وہ اِجّا کو ساتھ لے اور آج ہی دلّی جانے والی گاڑی میں شاہدرہ چلا جائے اور انوری کا بیان حلفی دیکھے اور متعلقہ مجسٹریٹ کی عدالت سے اس بیان کی تصدیق شدہ نقل لائے اور انوری کا بیان بھی لے۔

میں ضروری نہیں سمجھتا کہ آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ اس قسم کی کارروائی میں دفتری کارروائی کیا کی جاتی ہے اور قواعد و ضوابط کے کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ آپ کو کہانی کے ساتھ دلچسپی ہونی چاہیئے۔ اے۔ ایس۔ آئی رات کو روانہ ہو گیا۔ صغیر کو میں نے تھانے میں پابند رکھا۔ اِجّا کو میں نے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا کہ اُس نے اِدھر اُدھر ہونے کی کوشش کی یا اِدھر اُدھر ہو گیا تو میں اُسے چند دنوں میں ڈھونڈ نکالوں گا اور پانچ چھ سال کی سزا دلاؤں گا۔

کنواری بیٹی کی آبرو اور ماں کی بددُعا

میں اُسی روز یا شاید دوسرے روز اپنے گھر کو جا رہا تھا۔ راستے میں حفیظ سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ صغیر اب تو اُسے دھمکی نہیں دیتا؟

"نہ جی!"— اُس نے جواب دیا— "جب سے وحیدہ کو گھر لایا ہوں صغیر کی کبھی صورت نہیں دیکھی۔"

"اگر اب بھی تمہیں شک ہے کہ وحیدہ اور صغیر کے تعلقات ہیں تو میں تمہارا یہ وہم دُور کر دیتا ہوں"— میں نے اُسے کہا— "کیا تمہیں معلوم ہے انوری کہاں ہے؟.... نہیں.... اُسے صغیر نے تمہارے اور وحیدہ کے درمیان سے ہٹایا ہے۔"

میں نے یہ الفاظ کہہ تو دیے لیکن میں سخت پچھتایا۔ میں بھول گیا تھا کہ میں تھانیدار ہوں۔ میں سنبھل گیا اور باقی بات نگل لی۔

"کہاں ہے انوری؟"— حفیظ نے پوچھا۔

"یہاں نہیں ہے"— میں نے کہا— "اور اب کبھی اِدھر نہیں آئے گی۔ صغیر نے اُس کا باعزت بندوبست کر دیا ہے۔ اگر صغیر اور وحیدہ میں کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ کوشش کرتا کہ انوری تمہارے سامنے موجود رہے۔"

میں نے بات یہیں پر ختم کر دی کیونکہ راز کی بات منہ سے نکل گئی تھی لیکن حفیظ کا ردِعمل بڑا اچھا تھا۔

تیسرے روز اے۔ ایس۔ آئی واپس آگیا۔ وہ انوری کے بیان حلفی کی نقل متعلقہ مجسٹریٹ کی عدالت سے لے آیا تھا۔ اُس نے انوری کا الگ بیان بھی لیا

تھا۔ انوری نے اُسے بتایا تھا کہ اس آدمی کے ساتھ جو اُس کا خاوند تھا، وہ آئی تو اُسے ڈر تھا کہ یہ شخص اُسے خراب کرے گا لیکن اس شخص نے اس کے ساتھ جو رویّہ اختیار کیا اس سے بھی وہ پریشان ہوگئی کیونکہ اُسے اتنے اچھے رویّے کی توقع نہیں تھی۔ وہ اس شخص کے آگے بہت روئی تھی۔

یہاں میں آپ کو ایک اور دلچسپ بات سناتا ہوں۔ آپ خود غور کریں کہ انسان کی فطرت کیا ہے اور یہ انسان کو کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ان امیر کبیر لوگوں کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی، پھر اس شخص نے انوری کے متعلق بڑی بُری باتیں سُن کر بھی اس کے ساتھ کیوں شادی کر لی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ انوری کے حُسن میں کوئی ایسا اثر تھا کہ دیکھنے والا کچھ دیر اُسے دیکھتا ہی رہتا تھا لیکن چال چلن کی خراب لڑکی کو کوئی بھلا آدمی قبول نہیں کر سکتا۔

میرے اے۔ ایس۔ آئی نے یہی سوال انوری کے خاوند سے کیا۔ وہ کوئی راؤ صاحب تھا۔

"میں یہ بات تفتیش کے سلسلے میں نہیں پوچھ رہا"— اے۔ ایس۔ آئی نے اُسے کہا تھا— "ذاتی دلچسپی کے لیے پوچھ رہا ہوں۔"

اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے بتایا کہ راؤ پہلے تو ہنسا پھر وہ سنجیدہ ہوگیا۔ اُس نے کہا— "میں نے سات آٹھ سال ایسی بیوی کے ساتھ گذارے ہیں جو ذرا سی بھی خوبصورت نہیں تھی۔ اگر عورت شگفتہ مزاج اور کشادہ ظرف ہو تو اُس کی شکل و صورت اچھی لگنے لگتی ہے مگر میری بیوی بدمزاج اور مردہ دل تھی۔ وہ مجھے اتنی بدصورت لگتی تھی جتنی بدصورت نہیں تھی۔ مجھے خاندان کی عزت کا خیال تھا، ورنہ میں اُسے کبھی کا طلاق دے دیتا۔ مجھے گھر میں داخل ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پہلا بچہ پیدا ہُوا تو مجھے ذرا اطمینان ہُوا کہ گھر میں کچھ رونق تو آئی۔ بڑا پیارا بچہ تھا لیکن وہ دو سال کی عمر میں مر گیا۔ مجھے جو صدمہ ہُوا اس نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ اس صدمے نے مجھے شراب کا عادی بنا دیا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں پی تھی....

"پھر ایک اور بچہ پیدا ہُوا۔ پہلے بچے کی کمی تو پوری نہیں ہو سکتی تھی لیکن نعم البدل مل گیا اور میں نے اُس سے دل لگا لیا مگر یہ بچہ پونے دو سال کا ہو کے مر گیا۔ گھر سے میرا دل بالکل ہی اُچاٹ ہو گیا۔ بیوی مجھے اور زیادہ بُری لگنے لگی۔ انسان، مرد ہو یا عورت، اپنی تسکین کے کچھ ذریعے پیدا کر لیتا ہے مجھے خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ پیسہ، عزت، حیثیت۔ انگریز افسروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ مجھ جیسے آدمی بداخلاقی سے نہیں ڈرا کرتے۔ میں بڑی اچھی قسم کی طوائفوں کے ہاں جاتا رہا، شراب بھی چلتی رہی اور پھر ایک اور گناہ سرزد ہو گیا....

"میرا ایک دوست ہے۔ ہم کبھی کبھی شکار کو جایا کرتے ہیں۔ ایک صبح ہم شکار کو گئے۔ ہم آبادیوں سے دُور نکل گئے۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہُوا تھا۔ ہم ویرانے میں جا رہے تھے۔ ایک دیہاتی عورت سر پر ایک گٹھڑی اٹھائے چلی آ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک لڑکی تھی جس کی عمر پندرہ سولہ سال ہو گی۔ انہوں نے بڑے گندے کپڑے پہن رکھے تھے لیکن لڑکی خوبصورت تھی۔ وہ علاقہ غیر آباد تھا۔ میں نے دونوں کو روک لیا اور انہیں پیسے پیش کیے۔ عورت نے کہا کہ وہ بُرا کام کرنے والے لوگ نہیں اور یہ لڑکی کنواری ہے۔ میری بیٹی ہے۔ میرے دوست نے اور زیادہ پیسے دکھائے لیکن عورت نہ مانی....

"میں نے بندوق کی نالی اس عورت کے سینے پر رکھ دی اور اُسے بیٹھنے کو کہا۔ غریب دیہاتن خوفزدہ ہو کر بیٹھ گئی۔ مختصر یہ کہ میں نے اور میرے دوست نے لڑکی کو اوٹ میں لے جا کر زبردستی بے آبرو کر دیا۔ بندوقوں کے خوف نے انہیں بولنے نہ دیا۔ ہم نے دس دس کے تین نوٹ عورت کی گود میں پھینکے اور چل پڑے۔ اُس نے نوٹ بڑے غصے سے مروڑ کر ہماری طرف پھینک دیے اور جلے ہوئے لہجے میں بولی — 'تمہیں ساری عمر خوشی دیکھنی نصیب نہیں ہو گی۔ روتے عمر گزار جاؤ گے' — ہم دونوں نے اُس کی بددعا ہنسی میں ٹال دی....

"میں نے محسوس کیا کہ شکار پر جو لطف آیا کرتا تھا وہ لاپتہ ہے۔ میرا نشانہ

کبھی خطا نہیں گیا تھا مگر اُس روز چھ سات کارتوس ضائع ہو گئے۔ میرا دوست مجھ سے زیادہ امیر خاندان کا آدمی ہے۔ اُس نے کہا کہ مزہ نہیں آ رہا، چلو واپس چلیں۔ ہم واپس آ گئے۔ ہم جب اُس جگہ سے گذرے جہاں ہم نے ایک معصوم لڑکی کو بے آبرو کیا تھا، میرا دل بیٹھ سا گیا۔ میں نے ایسی گھبراہٹ کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے اپنے مزاج میں جھنجھلاہٹ بھی محسوس کی جو اتنی غالب آئی کہ معلوم نہیں میرے دوست نے کیا بات کہی اور مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اُس کے ساتھ غصے میں بات کی تو اُسے بھی غصہ آ گیا۔ ہم دونوں میں تلخ کلامی ہو گئی....

"کسی گناہ کی سزا بھگت رہے ہو"

"اُسی رات میرے پہلے بچے کو بخار ہو گیا۔ صبح تک بچہ تڑپنے لگا۔ بیک وقت دو ڈاکٹروں کو گھر لایا۔ دونوں نے مل کر نسخہ لکھا لیکن اس سے اگلی رات بچہ مر گیا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ بچے کے ساتھ میں بھی مر گیا۔ بچے کا صدمہ تو تھا لیکن ایک خوف مجھ پر آسیب کی طرح طاری ہو گیا۔ مجھے اُس معصوم لڑکی کی ماں کی بددُعا سنائی دینے لگی — 'تمہیں ساری عمر خوشی دیکھنی نصیب نہیں ہو گی۔ روتے عمر گذار جاؤ گے'۔ تب مجھے احساس ہُوا کہ میں نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ میرے گھر میں اگر ذرا سا سکون تھا تو وہ بھی نہ رہا۔ خدا گواہ ہے کہ میرے نصیب سے خوشی نکل گئی ....

"اُدھر میرے دوست کے ساتھ کیا ہُوا؟ اُس شکار کے پانچ چھ روز بعد وہ گھر آیا تو دیکھا کہ اُس کی بندوق کھانے کی میز پر رکھی تھی۔ بندوق کو وہاں نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اُس نے بیوی سے پوچھا کہ بندوق وہاں کس نے رکھی ہے۔ بیوی اُسے بتانے لگی کہ بچہ ضد کر رہا تھا کہ بندوق نکال کر دکھاؤ۔

اُس کے بچے کی عمر تین سال ہے۔ بندوق میز پر اس طرح پڑی تھی کہ اُس کی نالیاں باہر کی طرف تھیں۔ میرا دوست اِس طرح کھڑا تھا کہ دونوں نالیاں اُس کے کُولہے کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ بیوی ابھی اُسے بتا ہی رہی تھی کہ بندوق بچے کی ضد پر نکالی تھی کہ میرے دوست نے گھوڑے چڑھے ہوئے دیکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ دھماکہ ہُوا اور میرا دوست آگے کو جھکا اور گر پڑا۔ بیوی اُسے بتانے ہی والی تھی کہ ایک نالی میں کارتوس ہے کہ میرے دوست نے

ٹریگر دبا دیا۔ اُسے یہ توقع ہی نہیں تھی کہ اُس کی بیوی نے کارتوس لوڈ کر رکھا ہے....

"نالی کُولہے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ کارتوس کے چھرّے کُولہے میں گذر گئے اور ہڈیوں کے ٹکڑے ساتھ ہی لے گئے۔ ہسپتال والوں نے ٹانگ کاٹ دی۔ نقصان صرف ایک ٹانگ کا ہی نہ ہُوا، سب سے بھیانک نقصان یہ ہُوا کہ میرا دوست برائے نام خاوند رہ گیا۔ وہ مردانہ اوصاف سے محروم ہو گیا۔ اُس کی زندگی پہیوں والی کرسی پر گزر رہی ہے۔ وہ بیساکھیوں پر چلنے کے بھی قابل نہیں رہا....

"میرے دل پر خوف کی پکڑ اور مضبوط ہو گئی.... پھر میرا دوسرا بچہ پیدا ہُوا۔ میں اُسے ہوا بھی نہیں لگنے دیتا تھا۔ اُسے چھینک آتی تو میں کانپ جاتا۔ اُس کا جسم ویسے ہی ذرا گرم ہوتا تو میرے دل کی دھڑکن تیز اور گھبراہٹ ہونے لگتی۔ میں نے پونے دو سال بچے کو بچائے رکھا۔ ایک بار اُسے بھی بخار ہُوا اور پانچویں دن وہ مر گیا۔ میری دولت بچے کو موت سے نہ بچا سکی۔

شراب مجھے سکون نہ دے سکی۔ میں ایسے محسوس کرنے لگا جیسے مجھ پر آسیب کا اثر ہو گیا ہو۔ میں ہر وقت محسوس کرتا تھا کہ کوئی زندہ چیز میرے تعاقب میں رہتی ہے اور کبھی میرے وجود میں داخل ہو جاتی ہے اور جب میں سوتا ہوں تو وہ میرے پلنگ کے اردگرد گھومتی رہتی ہے....

"میری بیوی بچوں کے غم میں مر گئی۔ اُسے دوسرا غم یہ تھا کہ میں اُس کی طرف توجّہ دیتا ہی نہیں تھا اور گھر میں میری ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ بیوی کے مرنے کا مجھے ذرا سا بھی افسوس نہ ہُوا۔ میں سمجھا کہ میں آزاد ہو گیا ہوں مگر اُس لڑکی کی ماں کا تصوّر میرے ذہن میں اس طرح آنے لگا جیسے وہ میرے سامنے کھڑی ہو اور میں اُسے ہاتھ لگا سکتا ہوں۔ میں نے اپنی یہ ذہنی حالت اپنے دوستوں سے اور ہر کسی سے چھپائے رکھی۔ لوگ مجھے خوش باش امیرزادہ سمجھتے تھے۔ صرف دو گہرے دوست ہیں جنہیں میں نے اپنی حالت اور اس کی وجہ بتائی تھی....

"میں پیروں وغیرہ کے سخت خلاف ہوں۔ ایک روز کسی نے ایک عالم کا ذکر کیا جو دلّی کسی کے ہاں آئے تھے۔ پتہ چلا کہ وہ مذہبی امور کے عالم ہیں اور علم قیافہ میں بھی دسترس رکھتے ہیں۔ میں اُن سے ملا۔ اُن کی باتیں سنیں تو میں اُن سے متاثر ہُوا۔ میں نے انہیں علیٰحدگی میں ملنے کی درخواست کی۔ انہوں نے مجھے اگلی صبح آنے کو کہا....

"میں گیا۔ انہوں نے مجھے الگ بٹھالیا اور مجھ سے پوچھا — 'تمہارا چہرہ بتاتا ہے کہ تم ذہنی طور پر صحیح حالت میں نہیں ہو۔ کیا سوچتے رہتے ہو' —

میں نے انہیں آزمانے کے لیے اصل بات نہ بتائی۔ صرف یہ بتایا کہ مجھ پر ایک خوف طاری رہتا ہے اور ہر وقت بے چینی اور گھبراہٹ کی گرفت میں رہتا ہوں اور یہ بھی بتایا کہ میرے دو بچے مر گئے ہیں اور بیوی بھی مر گئی ہے۔ انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھا اور کچھ دیر میرے چہرے کو غور سے دیکھتے رہے۔ انہوں نے کہا — 'کسی گناہ کی سزا بھگت رہے ہو میاں! اللہ سے دل لگاؤ۔ دولت کے نشے میں گناہ تو کر سکتے ہو مگر خدا کی سزا سے تمہیں دولت نہیں بچا سکتی....

"میں نے اُن کے پاؤں پکڑ کر کہا کہ مجھے کوئی طریقہ بتائیں جس سے میں اِس آسیب سے آزاد ہو سکوں.... انہوں نے مجھ سے نہ پوچھا کہ میرے کون سے گناہ میرے آگے آئے ہیں، نہ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ آسیب کیسا ہے اور میری ذہنی حالت کیا رہتی ہے۔ انہوں نے مجھے گناہوں سے توبہ کرنے اور نیکی کے راستے پر چلنے کو کہا اور کچھ سوچ کر کہنے لگے — 'کسی کو مصیبت میں دیکھو، کسی کو مظلوم دیکھو، اُس کا ہاتھ پکڑ لو' — پھر انہوں نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ مصیبت زدہ اور مظلوم سے اُن کی مراد کیا ہے....

"میں نے اُن کے کہنے پر عمل کیا۔ اپنے آپ کو مار دیا۔ روپے پیسے کی ذرا سی بھی کمی نہ آئی لیکن میں نے امارت کا نشہ اتار دیا اور جس کسی کو مشکل میں دیکھا اُس کی مدد امداد کی۔ آخر اجّا نے مجھے انوری دکھائی۔ مجھے اب عیاشی کے لیے لڑکی کی نہیں بیوی کی ضرورت تھی۔ میرے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی لیکن میں کسی غریب کی بیٹی کو ڈھونڈ رہا تھا، البتہ اپنا ذوق قائم رکھا۔ مجھے خوبصورت

لڑکی کی تلاش تھی....

"انوری اُس سے زیادہ خوبصورت تھی جتنی میری خواہش تھی۔ اجّا نے مجھے بتایا کہ لڑکی اغوا ہو کر آئی ہے۔ میں نے انوری سے پوچھا کہ اُسے کس نے اغوا کیا ہے۔ اُس نے اپنی آپ بیتی سُنا ڈالی۔ اپنی ماں کے متعلق بتایا، اپنے باپ کی شرافت بتائی اور یہ بھی بتا دیا کہ اُس نے اپنی ایک سہیلی (وحیدہ) کے خاوند کو پھانس لیا تھا اور وہ اُس کے گھر جاتی تھی۔ اُس کی سہیلی خاوند سے الگ ہو گئی تھی۔ شاید اُسی نے انوری کو اغوا کرایا تھا....

"میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے تو میں اُسے گھر پہنچا دوں گا، اجّا کو خواہ میں رقم دوں خواہ اُسے گرفتار کرا دوں۔ انوری نے کہا کہ وہ اب گھر نہیں جانا چاہتی۔ وہاں اب ذلت کے سوا اُس کے لئے کچھ بھی نہیں رہا۔ میں نے اس لڑکی کو گمراہ اور مظلوم سمجھا۔ اسے ماں نے گمراہ کیا تھا۔ میں نے اجّا کو دو ہزار روپیہ دیا اور انوری کو ساتھ لا کر اُس کے ساتھ شادی کر لی۔ پھر پتہ چلا کہ اس کا گھر اُجڑ گیا ہے تو میں نے اسے کہا کہ وہ غم نہ کرے۔ میں اس کے غم کا شریک ہوں.... آپ نے اس سے پوچھ لیا ہے۔ کیا یہ خوش نہیں؟ میں آپ کو اپنے متعلق بتاتا ہوں کہ وہ آسیب اُتر گیا ہے جو انوری کے آنے سے پہلے مجھ پر قابض تھا۔"

"میری جگہ آپ کی بیٹی ہوتی تو...."

میں نے انوری کی گمشدگی کی فائل میں اُس کا بیان حلفی، اے۔ ایس۔ آئی کو دیا ہُوا اُس کا بیان اور راؤ صاحب کا بیان رکھ دیا۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو بتا دیا تھا کہ وہ راؤ سے کیا بیان لے۔ میں نے لکھ دیا کہ لڑکی بالغ تھی، اپنی مرضی سے چلی گئی تھی اور اُس نے اپنی مرضی کی شادی کر لی ہے۔ میں نے اِجّا اور صغیر کا نام نہ آنے دیا۔

اِجّا کو میں نے فارغ کر دیا اور صغیر کو سامنے بٹھا لیا۔

"میری بات غور سے سنو صغیر!" — میں نے اُسے کہا — "تم نے پہلے ایک سنگین جرم کیا تھا۔ وہ قاتلانہ حملہ تھا۔ میں نے طیش اور جذبات میں آکر تمہیں بری کرا لیا تھا۔ پھر تم نے ایک لڑکی کو اغوا کیا۔ میں نے اس میں سے بھی تمہیں بچا لیا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہ لو کہ تم میرے دوست ہو اور میں تمہارے جرائم پر دوستی کی وجہ سے پردہ ڈال رہا ہوں۔ میری ضرورت ہی ایسی تھی کہ تمہیں، تمہارے ساتھی اور اِجّا کو اس کیس میں نہ آنے دوں۔ یہ مت بھولو کہ میں تھانیدار ہوں۔ آج کے بعد تم نے معمولی سا بھی جرم کیا تو میں تمہیں زیادہ سے زیادہ سزا دلواؤں گا۔ تم میرے سر پر شیر ہوتے چلے جا رہے ہو۔ دماغ سے تھانیدار کی یاری کا نشہ اتار دو"

اُس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور میں نے اُسے چلے جانے کو کہا۔

بختیار اور زینو کا کیس کورٹ میں چلتا رہا۔ راحیلہ نے کورٹ میں وہی بیان دیا جو میں نے اُسے بتایا تھا۔ اُسے میں نے ملزم سے گواہ بنا دیا تھا۔ دائی وعدہ معاف گواہ تھی۔ بختیار روپے پیسے والا آدمی تھا۔ اُس نے بڑا قابل وکیل کیا

تھا جو ہندو تھا۔ زینو کا وکیل بھی اچھا تھا۔ یہ ایک ہنگامہ خیز مقدمہ تھا۔ مجھ پر دونوں وکیلوں نے باری باری مسلسل تین دن جرح کی تھی۔ اس میں مجموعی وقت ساڑھے چودہ گھنٹے لگا تھا۔ میں خود جرح کرنے کا ماہر اور عادی تھا لیکن ان وکیلوں نے مجھے چکرا دیا تھا۔ میری دُکھتی رگ یہ تھی کہ میں بختیار کو بچے کا قاتل ثابت کرنے کی کوشش میں تھا اور راحیلہ کو میں مظلوم ثابت کر رہا تھا لیکن دونوں وکیل اس مؤقف پر میری جان کھا رہے تھے کہ بختیار بچے کی پیدائش کے وقت وہاں نہیں تھا، نہ ہی بچہ بختیار کا تھا اور بچے کو راحیلہ اور دائی نے مارا ہے۔ سرکاری وکیل بھی خاصا تیز تھا لیکن دونوں وکیل اُسے بات نہیں کرنے دیتے تھے۔

مجھے ڈر تھا کہ دائی کے پاؤں اُکھڑ جائیں گے۔ وعدہ معاف گواہ بن جانا یا بنا لینا مشکل نہیں تھا، اُسے کورٹ میں کامیاب کرانا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ وکیل جب اُسے جرح کی چکی میں ڈالتے ہیں تو اُسے پیس کر رکھ دیتے ہیں۔ پولیس کو اُس کی ہر ایک بات کا ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے۔ وعدہ معاف گواہ کا یہ کہہ دینا کہ میں بھی اس جرم میں شریک تھا اور ان لوگوں نے یہ جرم اس طرح کیا ہے، کافی نہیں ہوتا۔ اُس کے بیان کو ثبوت اور شہادت کی سپورٹ دینی پڑتی ہے۔

دائی نے پورے تحمل سے جرح کا سامنا کیا۔ سیشن جج ایک ہندوستانی عیسائی تھا۔ اُس کے انداز اور رویّے سے پتہ چلتا تھا کہ میری شہادت سے اور میں نے جرح میں جو جواب دیئے تھے، ان سے وہ متاثر ہو چکا تھا۔ ملزموں کے وکیلوں میں سے ایک نے دائی پر ایک ایسا سوال کر ڈالا جس سے سیشن جج اُس سے بگڑ گیا۔ ایک وکیل نے دائی سے پوچھا — "جب تم جوان تھیں تو کتنے آدمیوں کے ساتھ تمہارے ناجائز تعلقات تھے؟"

وکیل جو بھی سوال کرنا چاہے کر سکتا ہے لیکن بعض جج دیکھ لیتے ہیں کہ اس سوال کا کوئی جواز ہے یا گواہ کو پریشان کرنے کے لیے ایسا بیہودہ سوال پوچھا گیا ہے۔ دائی سے وکیل نے یہ سوال کیا تو سیشن جج سے وکیل سے پوچھا کہ اس سوال سے وہ کورٹ کے سامنے کیا نکتہ واضح کرنا چاہتا ہے۔ وکیل نے

کہا کہ میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ عورت بدمعاش اور بدکردار ہے۔

"اِس عورت نے یہ تو نہیں کہا کہ یہ شریف عورت ہے" — سیشن جج نے کہا — "اگر یہ بدکردار نہ ہوتی تو اس سنگین اور بھیانک جرم میں شرکت نہ کرتی۔ یہ تو اپنے جرم کا اعتراف کر رہی ہے .... کورٹ آپ کے سوال کو بے مقصد سمجھتی ہے۔"

اس پر وکیلوں اور سیشن جج میں کچھ ترش کلامی ہو گئی۔

راحیلہ کی باری آئی تو کورٹ پر سناٹا طاری ہو گیا۔ اُس زمانے میں ایسے کیس نہ ہونے کے برابر تھے۔ راحیلہ نے آنسوؤں کے ساتھ بیان دیا۔ اُس کی ماں ملزموں کے کٹہرے میں بیٹھی اُسے گھور رہی تھی۔ راحیلہ بیان دیتے دیتے غصے اور جذبات سے مغلوب ہو گئی اُس نے دانت پیس کر اور انگلی ماں کی طرف کر کے کہا — "مجھے اِس ذلت میں پھینکنے والی یہ عورت ہے جو میری ماں ہے۔ اس کی کرتوت نے میری بڑی بہن کو گھر سے بھگا دیا ہے۔ اس کی کرتوت سے میرے باپ نے زہر پی کر خودکشی کی ہے اور یہ میرے بچے کی قاتل ہے۔"

وکیلوں نے اس کا بھی جرح میں بہت بُرا حال کیا۔ ایک وکیل نے اُس سے بھی ایک نہایت بیہودہ سوال کیا۔

راحیلہ نے جواب دیا — "میری جگہ آپ کی اپنی بیٹی ہوتی تو آپ اُس سے ایسا سوال نہ پوچھتے۔"

وکیل نے سیشن جج سے کہا کہ گواہ اُس کی توہین کر رہی ہے۔ اسے کہا جائے کہ تمیز سے بات کرے۔ اس پر سرکاری وکیل اور صفائی کے وکیلوں میں بہت جھک جھک ہوئی۔

میں نے شہادت اتنی زیادہ اور اتنی مکمل تیار کی تھی جسے صفائی کے وکیل جھٹلا نہ سکے۔ بختیار پر دوسرا الزام قاتلانہ حملے کا تھا۔ مضروب نے اور مُنگوں نے میری ہدایت کے مطابق کورٹ میں ثابت کر دیا کہ بختیار تکئے پر جوا کھیلنے آتا تھا۔ وہ تین چار مرتبہ مضروب کے آگے رقم ہار گیا تھا۔ اس کے پاس

رقم تھوڑی ہوتی تھی۔ اس طرح اس پر قرض چڑھتا گیا جو اس نے مضروب کو دینے سے انکار کر دیا۔ آخر ایک روز مضروب نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ بختیار کو مار اپیٹا۔ اُسی رات بختیار نے مضروب پر قاتلانہ حملہ کیا۔

یہ ساری کہانی غلط اور جھوٹی تھی۔ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ بختیار دراصل صغیر کو مارنا چاہتا تھا لیکن غلطی سے زخمی اس شخص کو کر بیٹھا۔ میں بختیار کو زیادہ سے زیادہ سزا دلانے پر تُلا ہُوا تھا۔

آخر سیشن کورٹ نے فیصلہ سنا دیا۔ بختیار کو بچے کے قتل میں عمر قید اور قاتلانہ حملے میں چھ سال سزائے قید اور زینو کو دس سال سزائے قید دی گئی۔

ہائی کورٹ میں دونوں نے اپیلیں دائر کیں جو مسترد کر دی گئیں۔

پانچ سال بعد، آخری ملاقات

جب کوئی کیس ختم ہو جاتا ہے اور ملزم سزا پا جاتے ہیں تو متعلقہ تھانیدار بہت خوش ہوتا ہے۔ پولیس کی زبان میں اسے "مقدمہ سزا ہو جانا" کہتے تھے۔ میں بھی جب کورٹ سے فیصلہ سُن کر نکلا تو بہت خوش تھا لیکن رات کو ہیں سونے کے لیے لیٹا تو نوزائیدہ بچے کی کھائی ہوئی لاش اور اُس کا پاک اور معصوم چہرہ میرے سامنے آگیا۔ ایسے کبھی نہیں ہُوا تھا۔ مقتولوں کی لاشوں نے میرے تصوّروں میں آکر مجھے کبھی پریشان نہیں کیا تھا۔ میں نے نوجوان اور بڑی ہی حسین لڑکیوں کی لاشیں دیکھی تھیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا تھا مگر اس بچے کا چہرہ ایسا میرے سامنے آیا کہ میں بے چین ہو گیا۔ اپنے جسم کے اندر مجھے تلخی محسوس ہونے لگی۔ انسان درندگی پر اُتر آئے تو درندوں کو مات کر دیتا ہے۔

پھر راحیلہ کا خیال آگیا۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ملک میں ایک طوائف کا اضافہ ہوگا۔

بڑا اچھا ہُوا کہ پانچ چھ مہینوں بعد اس تھانے سے میرا تبادلہ ہو گیا۔ نئے سے نئے کیس، نئی سے نئی وارداتیں سامنے آئیں اور راحیلہ اور اُس کا نوزائیدہ بچہ ذہن سے اُتر گیا اور یہ واردات میری ڈائری میں محفوظ رہ گئی۔ پھر وقت گذرتا چلا گیا۔

پانچ سال گذر گئے۔

جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ جاپان برما پر قابض ہو چکا تھا اور ہندوستان میں جاپان اور جرمنی کے جاسوس اور ففتھ کالمسٹ سرگرم تھے۔ مجھے عارضی طور

پر سی۔ آئی۔ ڈی کی ڈیوٹی دے دی گئی۔ جاسوسی کے ایک کیس کی سراغرسانی اور تفتیش کرنی تھی۔ ملٹری پولیس بھی ساتھ تھی۔ مجھے انگریز افسروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اِن سے بہت کچھ سیکھا۔ میں نے فرض کی ادائیگی میں دنیا کو بھول جانا اور دیانتداری انگریزوں سے سیکھی ہے۔

جاسوسی کے ایک کیس کے سلسلے میں پُرانی دِلّی کے ایک محلے میں ایک گھر پر چھاپہ مارنا تھا۔ ہم وہاں گئے۔ وہ گلی ویسی ہی تھی جیسی ہمارے شہروں میں گلیاں ہوتی ہیں۔ وہ گلی کشادہ تھی۔ اس محلے میں متوسط طبقے کے اور اس سے نیچے درجے کے لوگ رہتے تھے۔ وہاں ایک مکان تھا جو جاپان کے ہندوستانی جاسوسوں کا ایک ذیلی اڈہ بنا ہُوا تھا۔ ان کا خفیہ مرکز کہیں اور تھا۔

ہم نے چھاپہ مارا۔ دو آدمیوں کو گرفتار کیا اور کچھ اشیاء اور کاغذات مِل گئے۔ گلی میں تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ لوگ دُور دُور کھڑے تھے۔ منڈیروں پر اور دروازوں میں عورتیں کھڑی تھیں۔ جس مکان پر ہم نے چھاپہ مارا تھا، اُس کے سامنے والے مکان سے تیسرے مکان کے دروازے میں ایک خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ اُسے میں نے اس طرح دیکھا کہ میری نظریں تماشائیوں کے چہروں پر گھوم رہی تھیں۔ گھومتے گھومتے نظریں اُس عورت کے چہرے پر رُک گئیں۔ وہ دُور نہیں تھی۔ اُس نے ایک دودھ پیتا بچہ اٹھا رکھا تھا۔ اُس سے میری نظریں ملیں تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ میں یوں اُس کی طرف آہستہ آہستہ چل پڑا جیسے وہ مجھے ہپناٹائز کر کے اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔

اُس کے قریب جا کر میرے منہ سے حیرت زدہ سرگوشی نکلی۔ "راحیلہ؟"

"میں نے تو آپ کو فوراً پہچان لیا تھا"۔۔۔ اُس نے کہا۔ "اندر آئیں۔ تھوڑی دیر بیٹھیں۔"

"یہاں کس کے ساتھ رہتی ہو؟"

"اپنے میاں کے ساتھ"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔ "میں نے شادی کر لی تھی۔ دو بچے ہیں.... آپ میرے گھر نہیں آئیں گے؟"

"ڈیوٹی پر ہوں راحیلہ!" — میں نے کہا — "کبھی شام کے بعد آؤں گا جب تمہارے میاں گھر ہوں گے۔"

میں اُس شام نہ جا سکا۔ دو اور شامیں گزر گئیں۔ بہت کام تھا۔ آخر ایک شام فرصت مل گئی۔ میں راحیلہ کے گھر چلا گیا۔ اُس کا گھر ویسا ہی تھا جیسے مڈل کلاس گھر ہوتے ہیں۔ راحیلہ بہت خوش تھی۔ اُس کے سر پر دوپٹہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اُس کا ایک بچہ اڑھائی تین سال کا اور دوسرا چھ سات ماہ کا تھا۔ اُس کا خاوند جوان آدمی تھا جو مجھ سے بہت ہی مرعوب ہو گیا تھا۔

راحیلہ نے بتایا کہ کیس کا فیصلہ ہونے کے بعد دو تین آدمیوں نے اُس پر جال پھینکنے شروع کر دیے۔ وہ دن رات روتی رہتی تھی۔ حفیظ اور وحیدہ نے اُسے پناہ میں لے لیا اور کسی ایسے آدمی کی تلاش میں لگ گئے جو راحیلہ کے ساتھ شادی کر لے۔ وہ اتنی بدنام ہو گئی تھی کہ رشتوں کے امیدوار اُس کا نام سن کر بھاگتے تھے۔ آخر حفیظ کو اس آدمی کا سراغ ملا جو راحیلہ کا خاوند تھا۔ وہ بچپن میں یتیم ہو گیا تھا۔ ماں بھی بعد میں مر گئی۔ اُس نے محنت مزدوری کر کے تعلیم حاصل کی اور میٹرک پاس کر لی اور کسی نے اس پر مہربانی کی اور سرکاری نوکری دلا دی۔ وہ کلرک تھا۔

اس آدمی کا اپنا کوئی تھا نہیں۔ اُسے شادی کرنی تھی۔ عمر گذرتی جا رہی تھی۔ یہ کسی اور قصبے کا رہنے والا تھا۔ حفیظ کو کسی ملنے والے سے اس کا اتا پتہ ملا۔ حفیظ اُس سے جا ملا۔ پھر اُسے اپنے ہاں بلایا اور وحیدہ سے ملوایا۔ وحیدہ نے اُسے راحیلہ دکھا دی لیکن اُسے دھوکے میں نہ رکھا۔ راحیلہ کے متعلق ساری تفصیل سنا دی۔ وہ شادی کے لیے تیار ہو گیا اور ایک روز خاموشی سے اس کی شادی راحیلہ کے ساتھ کر دی گئی۔

راحیلہ نے مجھے بتایا کہ وہ پوری طرح مطمئن ہے۔ اُس کا خاوند تو ضرورت سے زیادہ مطمئن نظر آتا تھا۔

راحیلہ کے ساتھ یہ میری آخری ملاقات تھی۔